عشاق کے قافلے

14

سائیں

کمال خان شیرانی

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

سائیں

کمال خان شیرانی

(3جنوری1924.....5نومبر2010)

شاہ محمد مری

جملہ حقوق محفوظ

سائیں، کمال خان شیرانی
(سیاسی سوانح حیات)
مصنف :ڈاکٹر شاہ محمد مری

اشاعت :نومبر، 2011ء
قیمت : -/200روپے

زیر اہتمام : مہردر
انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشن
پی او بکس 26، کوئٹہ، بلوچستان

اسٹاکسٹ:
سیلز اینڈ سروسز
کبیر بلڈنگ، جناح روڈ، کوئٹہ۔
فون:2843229-81-92+
فیکس:2837672-81-92+

ژوب کے اپنے مرحوم انقلابی دوست

ٹرک ڈرائیور لاخک استاد، کے نام

فہرست

پیش لفظ	8
مناظر بھرا وطن	11
بچپن	13
حصولِ علم	19
سرکاری افسری	27
لٹ خانہ	32
نہنگ اور چھوٹی نہر؟	42
کمال خان سے میری شناسائی	46
کمال خان کُش کمال خان	59
شیریں سخن کمال خان	65
اردو اور پنجابی	80
کمال خان کی بلوچ دوستی	82
عوام دوست کمال خان	85

اچھی عادتیں	88
کتاب اور کمال خان	97
قلمکار کمال خان	106
آخری ملاقات	113
پسماندگان	118
'سیغیں ترمپاں گل زمیں آ'	121
ضمیمہ نمبر 1	126
ضمیمہ نمبر 2	128

پیش لفظ

جب مارکس اور اینگلز کے دوستوں میں سے ڈینیل ، ریتھ ،اور کونراڈ شرام یکے بعد دیگرے انتقال کرتے گئے تو وہ اکثر شکایت کرتے تھے کہ ''اولڈ گارڈ کی صفیں تیزی سے پتلی کی جارہی ہیں'' اور یہ کہ ''کوئی نیا خون سامنے نہیں آرہا ہے''۔

لگتا ہے کہ یہی حال آج بھی ہے۔ نئے لوگ کم کم پیدا ہو رہے ہیں اور اولڈ گارڈ کی صفیں پتلی سے پتلی ہوتی جارہی ہیں۔ اور پھر کمال خان جیسے اولڈ گارڈ کا بچھڑ جانا تو بہت بڑا نقصان ہے۔ پورے علاقے کے لئے۔ اس کا احساس وقتی طور پر جذباتی صورت میں ہوتا ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس بڑے انسان کی غیر موجودگی شخصی طور پر بھی تنگ کرتی رہے گی اور قومی وعلاقائی طور پر بھی۔

میں نے بہت غور کیا کہ کمال خان میرے لیے کس لحاظ سے اہم تھے۔ وہ میرے لئے فکری راہنمائی کے بطور بہت ہی اہمیت کے حامل تھے۔ مگر سچی بات یہ بھی ہے کہ فکری راہنمائی کی مسند پر تو اور محترم لوگ بھی کافی موجود تھے۔ تو کمال خان میں ایسا کیا کمال تھا.....!!۔ بات یہ ہے کہ سائیں بہت مہر کرنے والے اور بہت پیار کرنے والے دوست تھے۔ ایسے دوست جن کے لئے اداس ہوا جاتا

ہو۔جن سے بار بار ملنے کو جی کرتا ہو۔.....اور یہ مہربان شخص خود بھی بہت دیر تک احباب سے دور نہیں رہ سکتے تھے۔ ہر تین چار ماہ بعد اپنی بزرگ سنی اور فاصلوں کی طوالت کے باوجود کوئٹہ اپنے دوستوں سے ملنے آ جاتے تھے۔اور آ کر اپنے قصد کیے ہوئے وقت سے زیادہ گزار لیتے۔ایک بار اُن کے چھوٹے بیٹے نے ہر دو تین ماہ بعد والد کے کوئٹہ کے سفر پر اُن سے عجب معصوم انداز میں شکایت کی تھی؛

''خود جلیبی کھانے کوئٹہ چلے جاتے ہو اور مجھے ساتھ نہیں لے جاتے''۔

مگر ان کے جاننے والے تو جانتے ہیں کہ کمال خان کوئٹہ آ کر ہم سب کے محترم دوست خدائیداد کے کچے گھر میں رہتے تھے۔چینکی ہوٹل سے چائے پیتے تھے۔دہی کے ساتھ روٹی کھاتے تھے۔کہاں جلیبی۔سائیں تو بس اپنے بے شمار دوستوں سے صحبت و ملاقات کی شیریں جلیبیاں نوش کرنے آ جاتے تھے۔دلچسپ انداز میں خاموشی سے آ جاتے اور بالآخر جب واپس ژوب جانے کا قصد کرتے تو دوستوں کو بتائے بغیر ایک آدھ کو خاموشی سے کہہ دیتے؛

''پہ دیدن سوک نہ مڑیژی، (یاروں کی دید سے کبھی سیر نہیں ہوا جا سکتا)

اور.....

I have to tear my self away۔

خاکی، فانی اور بیالوجیکل کمال خان کو 90 برس کی عمر میں انتقال کرنا ہی تھا۔اُن کی صحت اب گرتی جا رہی تھی۔اُن کی سماعت اب مزید کمزور ہو گئی تھی۔ ہمارے اس پیشوا نے اب باقاعدہ ٹیک کے لئے لاٹھی اٹھا رکھی تھی۔شہر آتے ان کے لئے گلیاں پار کرنا بہت عذاب کا کام ہو رہا تھا۔وہ اب بہت نرم دل ہو گئے تھے۔چیزوں کو ایسا دیکھنے لگے تھے جیسے جانتے ہوں کہ یہ آخری بار ہے۔

چنانچہ کمال خان اِس خوبصورت دنیا سے، خوبصورت دوستوں کے خوبصورت گلشن سے خود کو Tear away کر گئے۔

مگر، ہمارے لئے ان کی رحلت اس لئے بھی زخمی کر دینے والی تھی، کہ ہم حسبِ معمول نابالغ ہیں، بدستور غیر منظّم ہیں اور ہمیشہ کی طرح تعداد میں کم ہیں۔

ہمیں اس لئے بھی اس کے چلے جانے کا رنج ہے کہ اُس کے اٹھائے ہوئے کئی سوال ابھی جواب طلب ہیں، ابھی کچھ الفاظ اُس کو بولنے تھے، ابھی لوگ اس کے کچھ الفاظ سن نہ پائے تھے، اس کے کچھ خواب تو پیدائشی مردہ تھے ہی مگر کچھ خوابوں کو زندہ دفن کیا گیا تھا، انہیں کھود کر نکالنا ابھی باقی تھا۔

اِس خطے کے عوام کمال خان کے چھن جانے سے اس لیے بھی صدمے میں ہیں کہ اس پورے خطے کی انقلابی تحریک میں کمال خان کا ثانی نہ رہا۔

ہر ایک شخص اُن کے بارے میں اپنی اپنی یادوں، اپنی اپنی کہانیوں اور اپنے اپنے مشاہدوں سے پُر سامعین کی تلاش میں، جماعت کی تلاش میں، تنظیم کی تلاش میں ہمیشہ کی طرح سرگرداں ہے.....اگر یہ شخص کمال خان شیرانی نہ ہوتے تو میں وثوق سے کہتا ہوں کہ اُن کی موت پر دوسروں کی اموات کی طرح سینہ کوبی ہوتی، اُن کی یاد میں سیمینار ہوتے، مضامین تحریر ہوتے، پیر بھائیوں کے آنسو ہوتے.....اور پھر، کمال خان کی تعلیمات پس منظر میں اور اُس کے نام کی رسوم پرستی شروع ہو جاتی۔

مگر وہ عام لیڈر تو نہ تھا کہ یہ سب کچھ کرنے دیتا۔کمال خان تو کچھ بھی نہ تھے سوائے اعلیٰ تعلیمات کے، حسین نظریات کے، اور ان نظریات پر استقلال کے ساتھ کھڑا رہنے کے۔اس نے نقل کرنے کے لئے، اپنی پیروی کروانے کے لئے ہمارے پاس اور کچھ چھوڑا ہی نہیں سوائے عملی انسان دوستی کے۔کمال خان بنی نوع انسان کے ساتھ وفادار تھے، محض اِس گروہ یا اُس فرقے کے ساتھ نہیں بلکہ پوری نوعِ انساں کے ساتھ وفادار تھے۔ وہ انسان کو خوش اور خوشحال دیکھنا چاہتے تھے، ظلم و جبر سے آزاد، ایک ہنستی مسکراتی، اور بدنیتی و تنگ نظری سے آزاد مسکراتی انسانیت!!

شاہ محمد مری

چھ جولائی، 2011

کوئٹہ

مناظر بھرا وطن

سائیں کمال خان کوہِ سلیمان کے شمالی سرے پر چلغوزے اور زیتون کے جنگلات سے بھرے مون سونی علاقہ میں پیدا ہوئے۔ ژوب میں، ژوب کے شیرانی قبائل میں، شنہ پونگہ نامی گاؤں میں..... یہ سارا علاقہ شین (سرسبز) ہے۔ آپ کو بے شمار مقامات کے نام ''شین'' کے لفظ کے ساتھ جڑے ہوئے ملیں گے۔ یہاں کا چلغوزہ دنیا کا مشہور ترین چلغوزہ ہے۔ یہ مخصوص اور گراں بہا چلغوزہ صرف کوہِ سلیمان کے اِس مخصوص حصے میں ہوتا ہے جو سائیں کمال خان کے قبیلے کی جائے سکونت ہے۔ اس کے لئے جو مخصوص بلندی، آب و ہوا اور ماحول کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے صرف یہیں میسر ہے۔

علاوہ ازیں زیتون، کہو اور دیگر نباتات سے بھرے جنگلوں پر مشتمل یہ گردن اکڑائے بلند و سربلند پہاڑ بہت ہی غربت زدہ ہیں۔ موسمِ بہار میں رنگ برنگ کے پھول پورے علاقے کو رنگتے نکھارتے ہیں۔ ایسی ہوش ربا خوشبو فضا میں بکھری ہوتی ہے کہ جس کے بیان کے لئے مست توکلی جیسا دانشور چاہیے ہوتا ہے۔ جگہ جگہ چشمے پھوٹتے ہیں۔ اور پھر مون سون کی بارشیں، لگتا ہے صرف اور

صرف کوہِ سلیمان پہ عاشق ہوں۔ ان زبردشت بارشوں کا نتیجہ ایسا سبزہ، ایسی سرسبزی کہ سائیں کبھی کبھی کہہ جاتے کہ ''خدا سبزے پہ عاشق ہے''۔

مگر، اس علاقے میں وسیع پیمانے پر ہونے والی مون سونی بارشوں کے استقبال کے لئے بڑی وادیاں موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ قبیلہ انتہائی غریب قبیلہ ہے۔ بھیڑ پالی اور شکار روٹی کا بڑا ذریعہ رہے ہیں۔ کمال خان اسی پس منظر کے جینز لے کر شرافت و ہمدردی و انسانیت کے اوجِ ثریا کو چھونے اس فانی دنیا میں آئے۔ یہ وسیع علاقہ قدرتی مناظر سے بھرا ہوا ہے، فطرت کے قریب ترین مگر شہروں اور سڑکوں سے دُور۔

کمال خان اس دنیا میں اُس وقت آئے جب تاریک ترین قبائلی دور اور برطانوی استعمار کی مسلط کردہ جہالت و پسماندگی اور غربت اُس کے پورے علاقے کی تقدیر کی سیاہی بن کر چھائی ہوئی تھی۔

وہ اُسی برس پیدا ہوئے جب دنیا میں انسان کا ایک دوسرا بڑا ہمدرد شمال میں سوویت یونین نامی ملک میں انتقال کر گیا۔ جی ہاں 1924ء میں۔ اور اِس سال جنوری کی تین تاریخ کو سائیں کی ولادت ہوئی۔ ایسا زمانہ جب دنیا ایک طرف تو جنگِ عظیم کی دوزخی رزمگاہ سے ابھی ابھی نکلی تھی مگر ساتھ ہی بعد از جنگ تباہی و غربت و بیماری کے دوسرے بے کراں صحرا میں داخل ہو چکی تھی..... (سائیں گفتگو کے دوران اپنی پیدائش کی اس تاریخ کو مانتے نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس تاریخ سے دو تین سال بڑے تھے۔ ''ماسٹر جی نے رجسٹر پر یہ تاریخ لکھ دی تھی۔'')

بچپن

کمال خان کے والد عیسیٰ خان ہندوستان اور بنگال میں تجارت کیا کرتے تھے۔ اور اس لحاظ سے وہ ایک جہاندیدہ شخص تھے۔ چونکہ وہ مادی و معاشی لحاظ سے ترقی یافتہ ہندوستان میں زندگی گزار رہے تھے، اس لئے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ژوب کی پسماندگی کی کئی معقول وجوہ، اور اسے دُور کرنے کے بہت سے راستے جانتے تھے۔ ان سب میں تعلیم سرِفہرست آتی ہے۔ اس لئے حتمی بات تھی کہ وہ اپنے بڑے بیٹے کمال خان کو علم کے نور سے منور کرنے کے لئے بہت فکرمند رہے ہوں گے۔

عیسیٰ خان کے اپنے گاؤں میں کوئی سکول موجود نہ تھا۔ لہٰذا عیسیٰ خان اپنے بڑے بیٹے کو اپنے گاؤں سے مشرق کی جانب ''کڑم'' نامی گاؤں لے گئے، جہاں بلو خان نامی ایک نیک نام اور دردِ دل رکھنے والے شریف آدمی رہتے تھے۔ کمال خان کو انہی کے حوالے کر کے عیسیٰ خان ہند میں اپنے کاروبار کے لئے دوبارہ اپنی مسافرت میں جُت گئے۔ صرف عیسیٰ خان ہی نہیں بلکہ دو اور والدین نے بھی اپنے بچوں کو اسی بلو خان کے گھر بھیج دیا اور انہوں نے بھی وہاں رہ کر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اُن میں ایک تو نصیب اللہ شیرانی تھے جو بعد میں بڑے افسر بنے اور دوسرے محترم کمال

دین کمال تھے جو بڑے ہو کر پشتو کے بڑے سکالر بنے۔

بلو خان کے ایک بیٹا تھا نور محمد۔ (وہ بعد میں صوفی نور محمد کہلائے اور میرے محترم دوستوں اور ہم خیالوں میں سے ایک بنے)۔ نور محمد اور کمال خان بہت اچھے دوست، ہم عمر اور سکول فیلو رہے۔ دونوں بچوں کی مثالی دوستی رہی اور بڑے ہو کر بھی وہ اس دوستی اور ہم خیالی کو نبھاتے رہے۔

آیئے سائیں کی روح کو خوش کرنے اور اُن کی اپنی شخصیت کو اچھی طرح جان لینے کے لئے اُن کے اِس دوست کا تذکرہ کرتے ہیں۔

صوفی نور محمد سے میری ملاقات ژوب میں ہوئی تھی جب میں 1981ء میں ملازمت کے سلسلہ میں وہاں گیا تھا۔ عام سا پشتون، عام سا شیرانی، عام سا قبائلی۔ لمبا قد، سر پہ کالی پگڑی، نمازی پرہیزگار۔ بہت بے چین روح کے مالک تھے وہ۔ بہت تیز تیز اور بہت زیادہ بولتے تھے۔ بولتے بھی جاتے تھے اور ہنستے بھی جاتے تھے، جیسے گانے کے ساتھ طبلہ اٹوٹ ہوتا ہے۔ پشتونوں میں حاجیوں کی بہتات ہوتی ہے، ملا بھی تو بے شمار ہوتے ہیں، البتہ صوفی کا تخلص بہت کم پایا جاتا ہے۔ مگر اس شخص کو پتہ نہیں کیوں صوفی کہا جاتا تھا۔ اور وہ نکلا بھی پکا صوفی، پکا درویش۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ صوفی نور محمد کڑمئی نامی گاؤں میں رہتے تھے، جہاں آج سے نصف صدی قبل بھی سکول موجود تھا۔ جبکہ سائیں کمال خان پہاڑ میں رہتے تھے جہاں کوئی سکول اور کوئی سڑک نہ تھی۔ چنانچہ سائیں کو اُن کے گھر بھیجا گیا تاکہ وہ تعلیم حاصل کر سکیں۔ صوفی کے والدین نے سائیں کو بہت لاڈ بہت پیار سے رکھا۔ بالخصوص صوفی کی والدہ نے۔ وہ بہت ہی حلیم اور نجیب دل کی مالکن تھیں۔ یوں سائیں کمال خان اور صوفی نور محمد بچپن کے دوست اور ساتھی بنے۔

صوفی نے پرائمری تک اپنے گاؤں میں پڑھا۔ اور مڈل کا امتحان ژوب سے پاس کیا۔ اس طرح وہ مڈل پاس تھے۔ (اب وہ زندہ ہوتے تو یقیناً کہتے کہ ''اُس زمانے کا مڈل آج کل کے ایم اے سے بھی زیادہ پڑھا لکھا تھا'')۔

پھر جب سائیں جوان ہوئے، سیاسی بنے اور نوکری وغیرہ چھوڑ کر اپنے علاقے میں ایک

دینی مدرسہ کھولا تو بھی صوفی ان کا ساتھی تھا۔خصوصاً اس مدرسہ کے لئے چندہ مہم میں صوفی نے بہت سرگرمی سے کام کیا۔ہم آپ کو یہ ضرور بتائیں گے کہ سائیں کمال خان کے دو شیرانی، بہت ہی گہرے دوست تھے۔ایک تو اُن کے گاؤں سے مشرق کی جانب پانچ گھنٹے کی مسافت پہ کڑمئی گاؤں میں رہتا تھا جس کا نام صوفی نور محمد تھا۔اور دوسرا آٹھ گھنٹے کے فاصلے پر شمال مغرب کی جانب مولوی دین محمد شیرانی تھا۔دونوں ان کے ذاتی دوست بھی تھے اور ہم فکر بھی۔جدوجہد کے ساتھی تھے ان کے' بہت وفادار' بہت بہادر اور بہت مستقل مزاج دوست۔سائیں کے یہ دونوں شیرانی دوست ژوب کی وادیوں میں عوام کے حقوق' تعلیم اور آزادیوں کی جدوجہد سے بھرپور زندگیاں گزارتے رہے۔

مجھے یاد ہے کہ صوفی نور محمد کے ہاں ذہنی طور پر بلوغت اور اس سے وابستہ ہر بات چالیس کی دہائی سے شروع ہوتی تھی۔آپ ان کی ہر خوبصورت بات کے اوائل میں 1940ء لکھ ڈالیں یا پھر 1944ء۔یوں وہ سیاست میں 1940ء ماڈل کے انسان تھے۔(یہ اصطلاح ژوب کے ہمارے دوست الیاس کی دی ہوئی ہے) اور یہ ماڈل بہت اچھا ہوا کرتا تھا۔سادہ' آسان' سچا' مخلص' بااعتبار اور وفادار ماڈل' شریف ماڈل' جنتی ماڈل..... شاید بلوچستان میں جدید سیاست کے اولین ماڈل یعنی 1920ء کے ماڈل کی سب سے ترقی یافتہ شکل یہی 1940ء کا ماڈل تھا۔اسی ماڈل سے تو بعد کے امپروو ڈ ماڈل بنتے گئے، اسی کی آگے کلوننگ ہوتی رہی۔

جس وقت صوفی سے میری ملاقات ہوئی، اس زمانے میں افغانستان میں خلق ڈیموکریٹک پارٹی کا ثور انقلاب برپا ہوئے چار برس ہو چکے تھے۔صوفی کو نور محمد ترہ کی کے ساتھ پیار کی حد تک وابستگی تھی۔وہ اس انقلاب کو خطے کے پسماندہ عوام کے لئے نور کا مینار سمجھتے تھے۔وہ افغان ثور انقلاب کی عطا کردہ نعمتوں کو بڑے فخر سے بیان کرتے تھے۔انہیں افغانستان میں تعلیم کو لازمی اور مفت قرار دینے، سود کا خاتمہ کر دینے، زرعی اصلاحات ہونے اور خواتین کے حقوق کے بارے میں انقلابی حکومت کے فرمان (آرڈیننس) خاص طور پر اچھے لگتے تھے۔وہ اٹھتے بیٹھتے اُن کا ذکر کرتے تھے۔صوفی اس انقلاب کے دفاع کا بین الاقوامی فریضہ نہایت سرگرمی سے ادا کرتے رہے۔نہ اسے نام کی

تمنا تھی نہ پرمٹ اور پلاٹ کی حرص تھی۔''چالیس، چوالیس ماڈل'' والوں کیلئے یہ چیزیں ویسے ہی حرام ہوتی تھیں۔صوفی اس انقلاب کے اس لئے بھی حامی تھے کہ ان کے اپنے خیالات اور اُس حکومت کے اقدامات میں ایک گہری ہم آہنگی اور ایک بے کراں یکسانیت تھی۔

صوفی نور محمد کو رجعت پسندی سے بہت نفرت تھی۔اُن کے خیال میں ملاّ کو سیاست نہیں کرنی چاہیے۔وہ سیاست میں ملا کے رول کو بہت نقصان دہ سمجھتے تھے۔اسی لئے ژوب میں وہ ملاؤں کی پارٹی کے خلاف سیاست کرنے والے بہت ہی نمایاں نام تھے۔اسی طرح وہ نواب، سردار اور خان سے نفرت کرتے تھے جو تعلیم، سڑک، بجلی اور عوام کی ترقی کے دیگر معاون مظاہر کے خلاف ہوتا ہے۔خان کو وہ ظلم، جہالت اور بنیاد پرستی کا منبع گردانتے تھے اور چونکہ مارشل لاء، ملا اور خان آپس میں ایک ہوا کرتے تھے لہٰذا صوفی نور محمد بیک وقت اسٹیبلشمنٹ، فیوڈل اور رجعت پسندی کے خلاف برسر پیکار تھے..... اکیلے، دور دراز مگر بہت بہادری کے ساتھ۔اور جب اس دیرینہ اور جاں گسل جدوجہد کی صداقت کا ثبوت ثور انقلاب کی صورت انہیں میسر آیا تو پھر وہ مزید تیزی توانائی کے ساتھ اپنے مشن پہ لگ گئے۔

علاقہ اَن پڑھ تھا اس لئے لکھا پڑھی، پمفلٹ، پوسٹر تو کسی صورت ابلاغ کا میڈیا نہیں بن سکتے تھے۔اور خود صوفی بھی کوئی بہت بڑے ''پڑھا کو لکھا کو'' نہیں تھے۔اسی لئے وہ مجسم عمل اور مصمم جدوجہد تھے۔جلسوں میں اور شادی وغم کی محفلوں میں اپنی بات کہتے رہتے۔قبائلی بھاری پن کے ساتھ مہذب انداز میں، مگر صاف اور واضح طور پر۔نہ ملا کے فتوؤں کا ڈر (جو اس زمانے میں بہتات سے جاری کئے جاتے تھے) نہ سردار اور خان کی سازشوں کا خوف اور نہ ڈی سی اور اے سی کی حاکمیت کی پرواہ۔

صوفی معروضی طور پر خان عبدالصمد خان اچکزئی کے ہم فکر بنے تھے۔وہ جب خان صاحب کی پارٹی میں شامل ہوئے تو اس وقت خان صاحب جیل میں تھے۔یعنی صوفی نے انہیں دیکھا نہ تھا۔واضح رہے کہ خان صمد خان اچکزئی اپنے پسماندہ سماج میں انسانی فلاح کی سیاست کرنے

والوں کے لئے چھتری تھے۔اُس دور میں بلوچستان کے سیاست دان بیک وقت سیاست بھی کرتے تھے،سماجی کام بھی کرتے تھےاورلوگوں کے انفرادی مسائل سے بھی وابستگی رکھتے تھے۔سامراج دشمنی اورکیڈر بلڈنگ والی سیاست اُن لوگوں کا وطیرہ ہوتا تھا۔اوران کا ساتھ ہمیشہ وہی لوگ دیا کرتے تھے جوخودانسانیت کا بہترین نمونہ ہوتے تھے۔صوفی نورمحمد شیرانی ایسے ہی ایک بڑے انسان تھے۔

انہیں بلوچوں سے بڑی محبت تھی۔وہ بلوچ ترقی پسندتحریک کے خیرخواہ تھے۔اوربلوچ سامراج دشمن تحریک کے اکابرین کی بڑی تکریم کیا کرتے تھے۔صوفی ایک بین الاقوامیت پسندشخص تھے۔

ملک کے دور دراز گمنام گوشوں میں پڑے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ لیویز کی نوکری ہی مل سکتی ہے۔چنانچہ صوفی بھی نوکر ہوگئے۔لیویز میں ان کا عہدہ بنالیویز محرر۔رشتیامل نے اپنے والد سے پوچھ کر مجھے بتایا تھا کہ اُن کی پہلی پوسٹنگ قلعہ سیف اللہ میں ہوئی تھی۔قلعہ سیف اللہ پشتونوں کے نواب کا ہیڈکوارٹر ہے۔وہاں رہ کرصوفی نے سرداری نظام کی ہولناکیوں کا بغورمطالعہ کیااور وہیں سے انہیں عام انسان کی تکالیف کا ادراک ہوا۔

باقی،کیا کڑمئی کیا اس کی زراعت! چار میں سے ان کے دو بیٹے دبئی میں مزدوری کرتے ہیں۔بس سفید پوشی والی زندگی تھی۔مگرصوفی بہت سخی آدمی تھے۔ان کے گاؤں جاؤ تو دنبہ ذبح ہونا گویا لازمی تھا۔البتہ ہم فکر بے تکلف دوستوں کے لئے مرغ یا خشک گوشت بھی چل جاتا تھا۔بہت فخر سے بتاتے تھے کہ ان کا بھتیجا کیڈٹ کالج میں پڑھتا ہے۔یہی نوجوان بعد میں میڈیکل کالج میں گیا۔خدا کرے اس کے پسماندگان میں رہ جانے والے بھتیجے اُن کی فکراوراُن کے نظریے کے ساتھ شایان شان سلوک کریں۔

ہرگاؤں کے فہمیدہ انسانوں کی طرح صوفی بھی خبروں اوراطلاعات کے بھوکے تھے۔ان کے گاؤں میں کوئی اخبارنہیں جاتا تھا۔شہرآتے تو دوپہرمیرے ساتھ گزارتے اور نئے پرانے سارے اخبارایسے سمیٹتے جیسے قحط زدہ بلوچستان کی زمین بارش کی ایک ایک بوند جذب کرتی ہے۔(میں ژوب میں میڈیکل افسرتھا)۔وہ اخبارخاموشی سے نہیں پڑھتے تھے۔بلکہ زورزور سے پڑھتے جاتے،جیسے

میراسٹڈی سرکل لے رہے ہوں۔گوکہ انہیں پتہ تھا کہ میں نے وہ اخبار پڑھ رکھا ہے۔پڑھتے پڑھتے وہ درمیان میں اپنا تبصرہ ضرورگھسیٹ لیتے،یا کوئی سوال پوچھ لیتے۔

گاؤں میں ریڈیوہی ان کے لئے اطلاعات کا سرچشمہ تھا۔ریڈیوہی ان کا نظریاتی استادتھا اوروہی ان کا فکری رفیق بھی تھا۔وہ سرمایہ داری نظام کا ترجمان بی بی سی سنتے،سوشلزم والا ماسکو سنتے اورسیاسی ثقافتی ہم جولی کابل ریڈیو سنتے تھے۔اس طرح بغیراخبار پڑھے،بغیررسالہ دیکھےاوربغیر کتاب کا مطالعہ کئے اتنا کھرا،ستھرا،واضح اوراَپ ٹو ڈیٹ موقف رکھتے تھے کہ جوکراچی اورلاہور کے جغادری دانشوروں کے نصیب میں بھی نہ تھا۔

صوفی نورمحمد مجھ پہ بہت مہربان تھے۔مجھے ژوب میں قیام کے دوران اپنے نظریاتی مخالفین کی زیادتیوں کے خلاف مزاحمت میں ان کی یکجہتی ہمیشہ حاصل رہی۔وہ اکثر مجھ سے ملنے آتے تھے۔ایک توان کی شفقت تھی،دوسراان کی دانتوں کی تکلیف تھی جو ہماری ملاقاتوں کا بہانہ اوروسیلہ بن جاتی۔میراڈینٹسٹ رفیق کبھی ان کا کوئی دانت نکال رہا ہوتا،کبھی کسی کی پیمائش کررہا ہوتا اورکبھی نیا دانت لگا رہا ہوتا۔یوں بہت قریب ہوکر میں نے اس بڑے شخص کے اندرنظریاتی وابستگی،جدوجہد میں دوام و تسلسل اورنام وشہرت سے گریز جیسے اوصاف دیکھے۔اسی کی تحریری رسید دینے کے لئے میں نے کمال خان کے تذکرے کے اندراُن کے لئے یہ چندسطریں لکھیں،وگرنہ صوفی نورمحمد شیرانی جیسے درویش اور اللہ کے ولی کومیری تعریف اوردعاؤں کی کوئی ضرورت نہیں۔انہی کے طفیل ہم سب کی خیرہو،ہمارے ایمان سلامت رہیں۔

حصولِ علم

سائیں کمال خان جیسے کثیر جہتی شخص کو اُس کی زندگی کے سارے متعلقہ سیاق وسباق سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اُسے ایک آدھ خانے میں فٹ کرنا بہت ناممکن ہے۔ ایک بچے کی حیثیت سے اُس کی شخصیت ابھی بننی تھی، ابھی ڈھلنی تھی۔ اور شخصیت سازی یا تو خاندان کی بھرپور توجہ اور تربیت سے ممکن ہوتی ہے یا، سکول اور کالج میں۔ اور یا پھر اچھے بشر دوست دوستوں کی کمپنی میں (خواہ یہ کوئی سیاسی پارٹی ہو یا سماجی انجمن ہو)۔

سائیں کمال خان کے معاملے میں سکول وکالج ہی وہ جگہیں تھیں جہاں مہربان اساتذہ کی راہنمائی میں اُس کی صلاحیتوں کو واضح سمت ملتی رہی۔ کمال خان کی تربیت کے اس پیراگراف میں مجھے بس ایک بات سوجھ رہی ہے؛ دوستی، وفا۔ سائیں' شاید انسانوں سے دوستی کے لئے ہی اس جہاں میں آیا تھا۔ وہ دوستی کرتا تھا اور پھر دوستی نبھانے، اور وفا کرنے کے لئے سب کچھ قربان کر دیتا تھا۔

خاندان میں صرف کمال خان کو ہی تعلیم کی نعمت میسر ہو سکی تھی۔ اُس کے دوسرے بھائی نواب خان، ابراہیم خان اور مٹھا خان تعلیم سے تقریباً محروم ہی رہے۔ اس کی تینوں بہنیں بھی ناخواندہ

رہیں۔

ننھے کمال خان نے ''کڑمہ'' نامی گاؤں میں پرائے گھر میں رہ کر پرائمری پاس کیا۔ جس کے بعد وہ ژوب شہر میں مڈل کے لئے داخل ہوا۔ ظاہر ہے ٹرانسپورٹ نہ تھی۔ شیخ سعدی کی طرح گدھے پر سامان لادا اور شہر آیا۔ اس نے مڈل سکول ژوب سے مڈل پاس کیا۔ اچھے نمبر لیے، سکالر شپ حاصل کی اور 1939ء کو مزید تعلیم کے لئے پشین چلا گیا۔

اُس زمانے میں کوئٹہ 1935ء کے زلزلے سے تباہ ہو چکا تھا اور کوئٹہ کا اچھا سکول قریب ہی واقع پشین منتقل ہو چکا تھا، وہ سکول جہاں وظیفہ حاصل کرنے والے بچوں کو داخلہ ملتا تھا۔ کمال خان اُسی اچھے سکول یعنی سنڈیمن ہائی سکول میں داخل ہوا۔ جہاں سے اسے زندگی بھر کے لئے دو مخلص ساتھی اور جگری دوست ملے؛ خدائیداد اور میر عبداللہ جان جمالدینی۔ وہ دونوں بھی پشین میں پڑھ رہے تھے۔ جمالدینی نوشکی سے وظیفہ حاصل کر کے یہاں آیا تھا اور سائیں کا کلاس فیلو بنا' جبکہ خدائیداد اُن دونوں سے ایک سال سینئر تھا۔

پشین میں ایک تو دیہی زندگی تھی جہاں سادگی، سچ، باہمی ہمدردی اور خیر وخیر خواہی والی ابتدائی زندگانی تھی۔ دوسری بات یہ کہ یہاں پڑھائی بہت اچھی تھی۔ مجموعی طور پر ماحول اچھا تھا اور ادبی ثقافتی ذوق اچھا تھا۔ وہاں ادبی بحثیں ہوتی تھیں۔ لڑکوں کے گروپ بنے ہوئے تھے جو ادبی علمی موضوعات پر پڑھتے تھے، آپس میں تبادلہ خیال کرتے تھے اور سوال جواب کرتے تھے۔ عبداللہ جان، کمال خان اور خدائیداد خان پڑھاکو بچے تھے۔ یہ تینوں دوست باہم قریب تھے۔ اُن لوگوں کے بقول نہ صرف اُن کا آپس میں تعارف، بلکہ دنیا کے بڑے مفکروں اور فلاسفروں سے بھی ان کی شناسائی' اقبال کی شاعری کے ذریعے ہوئی۔ دراصل ان ''تین'' کے درمیان دوستی کا بندھن اقبال کی شاعری ہی کی وجہ سے قائم تھا۔ اقبال نے ان لوگوں کے ذہن وشعور کے ٹھہرے پانیوں میں پہلا بڑا پتھر مارا جس کی لہریں پھر زندگی بھر طوفان برپا کئے رہیں، اور صرف موت پر جا کر ہی سکوت پذیر ہو سکیں۔

پشین سے میٹرک کر لی تو کمال خان اور اُن کے زندگی بھر کے دوست عبداللہ جان جمالدینی نے مزید تعلیم کے حصول کیلئے علیگڑھ جانے کی ٹھان لی۔ مگر ان کے اس فیصلے کو ان کے اچھے استاد جناب ہاشم غلزئی نے تبدیل کرا دیا۔ چنانچہ وہ اپنے اس فہمیدہ استاد کے مشورے کے مطابق علی گڑھ کے بجائے 1941ئمیں اسلامیہ کالج پشاور چلے گئے۔

یہی تو وہ جگہ تھی جہاں اُن کی زندگیاں بدلنی تھیں، زندگی کے اطوار اور طریقے بدلنے تھے۔ یہ ایک عظیم ادارہ تھا جہاں خطے کے چند قابل ترین اساتذہ متعین تھے۔ جو واقعتاً استاد تھے۔ وہ شاگردوں کی اولاد کی طرح تربیت کرتے تھے۔ علم کے ساتھ ساتھ ذہنی اور فکری مشقیں کرواتے۔ ان لوگوں کے ایک استاد کا نام تیمور تھا۔ جس نے کمال خان اور عبداللہ جان پر خوب محنت کی۔ ایک اور اچھا استاد محمد موسیٰ کلیم تھا جس کا یہ شعر ہمیشہ ہمارے دونوں بزرگوں کی زبان پہ ہوتا تھا؛

جی میں آتا ہے جلا دوں کوہِ طور کو
پھر خیال آتا ہے کلیم بے زباں ہو جائے گا

مگر اُن کے ایک اور استاد تھے صاحبزادہ ادریس۔ وہ جسمانی طور پر معذور تھے اور وھیل چیئر استعمال کرتے تھے۔ یہ مفکر و فلسفی استاد اُن کا بہترین کوچ بنا۔ اس نے اپنی خوبصورت طرز سے دنیا بھر کے علوم کے دروازے اِن نوخیز طالبوں پر وا کر دیے۔ ایسے طالب علموں پر کہ بقول ادریس صاحب؛ ''نہ جن کے گاؤں میں دھوبی ہے نہ نائی، پانی کے کنارے بیٹھ کر قینچیوں سے اپنی داڑھی تراشتے رہتے ہیں''۔

صاحبزادہ ادریس نے انہیں گورکی اور گوئٹے پڑھوائے، ہیگل و اینگلز کی تصانیف دیں، ارسطو و افلاطون سے متعارف کرایا اور رسل و برناڈ شاہ کا شوق دلوایا۔

صاحبزادہ نے اُن کی کایا پلٹ کے رکھ دی۔ وہ خود بہت اچھے ناول نگار تھے۔ عالمی شہرت یافتہ ناول ''پیغلہ'' (دوشیزہ) انہی کی تصنیف ہے۔ علاوہ ازیں وہ بہت خوبصورت فلسفیانہ شاعری بھی کرتے تھے۔ (کمال خان آخر تک اُن کے ایک شعر کا ہمیشہ ورد کیا کرتا تھا جس کا مفہوم ہے؛ خوشی

کی ساعتیں پرندے کی طرح تیز رفتار، اور دکھ کا وقت جیسے چیونٹی کی چال)۔

صاحبزادہ نے اُن کے دل میں موجود راسخ روایتوں کو کھرچ کر دھو دیا اور اُن میں شک کا پاکیزہ خلفشار انڈیل دیا۔

آیئے اِس بڑے انسان اور اچھے معلم سے متعارف ہو جائیں؛

صاحبزادہ ادریس دو مارچ 1902ء کو جدید تعلیم سے منور، صاحبزادگان کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ وہ دو سال کی عمر میں اپاہج ہو گئے اور چلنے کے قابل نہ رہے۔ مگر کئی پاؤں والوں کی رفتاریں بڑھانے کے لئے گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل ہوئے۔ بچپن کے کچھ ابتدائی سال اپنے ماموں صاحبزادہ فضل الرحمٰن صاحب کے ساتھ گزارے جو ڈیرہ اسمٰعیل خان میں مہتمم خزانہ تھے۔ پیروں سے معذوری کی وجہ سے ان کی تعلیم میں تھوڑی سی حرج آئی۔ اور ان کے کچھ برس ضائع بھی ہو گئے۔ مگر 1923ء میں انہوں نے میٹرک پاس کر لیا۔ 1927ء میں اسلامیہ کالج سے اکنامکس بی اے آنرز کے ساتھ کیا۔ جس کے بعد وہ علیگڑھ چلے گئے اور ایم اے، ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اس کے بعد مردان میں وکالت کی کوشش کی مگر ان کے اپنے بقول ''جھوٹ کی دکان'' نہ چلی۔ پھر 1932ء سے 1937 تک انہوں نے سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان (جو اُس وقت صوبے کے وزیر اعلیٰ تھے) کے نائب کی حیثیت سے کام کیا۔ 1938ء میں انہوں نے اسلامیہ کالج میں پولیٹیکل سائنس اور اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ وہ 1953ء تک وہیں رہے۔ 1953ء میں وہ یونیورسٹی میں اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ اور 1959ء میں وہ ریٹائر ہو گئے۔ 1961ء میں یونیورسٹی نے ان کی خدمات ایک تحقیقی کام کے لئے حاصل کیں اور چھ سال تک وہ یہ کام کرتے رہے۔ 1967ء میں انہوں نے اپنی پانچ رپورٹیں پیش کیں۔ اور اپنا کام مکمل کر دیا۔

صاحبزادہ ادریس نے 1942ء میں شادی کی۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ڈاکٹر نگہت یاسمین ان کی بڑی بیٹی ہیں۔ (اُن سے میری ملاقات بہت یادگار تھی۔ ایک اچھی میزبان کے

علاوہ اپنے والد کے بارے میں معلومات کا ایک خزانہ ہیں۔انہوں نے مجھے صاحبزادہ صاحب کے بارے میں بہت کچھ بتایا)ان کا بڑا بیٹا کینیڈا میں انجینئر ہے۔ان کی چھوٹی بیٹی چارسدہ میں میجر شیر شاہ کے ساتھ بیاہی ہوئی ہے۔چھوٹے بیٹے ڈاکٹر سہیل اسپیشلسٹ ڈاکٹر ہیں۔

صاحبزادہ صاحب جب ایف ایس سی میں داخل ہوئے تو اس دوران وہ پشتو میں شاعری کرنے لگے تھے۔1938ء میں جب وہ اسلامیہ کالج آئے تو انہوں نے ایک طویل مضمون Why thou shall not hate پڑھا۔انہوں نے کہا کہ ہر شخص جو کام کرتا ہے اس کے خیال میں وہ صحیح ہے۔اس طرح ایک گناہگار جب گناہ کرتا ہے تو اس کے خیال میں وہ کام صحیح ہوتا ہے۔اُن کی تعلیم تھی کہ جسمانی معذوروں کے ساتھ ہمدردی ضروری ہے۔اس طرح ذہنی مریضوں کے ساتھ بھی ہمدردی کرنی چاہیے۔انہوں نے اور بھی کئی مضامین لکھے تھے۔اس زمانے میں ہی انہوں نے سوشلزم اور اسلام پر چار چھ تقریریں کیں۔ پھر انہوں نے ایک مضمون The Economic implication of an islamic state لکھا۔یہ مضمون بعد میں یونیورسٹی جرنل میں شائع ہوا تھا۔

وہ مفلوج شخص چار برس تک ان دو،نوخیز ذہنوں کی تربیت کرتا رہا۔کھیل دیکھئے آسمانوں کے کہ ٹھیک 60 برس بعد شاگرد (عبداللہ جان) کو بھی مفلوج بننا تھا اور اسی فالج کی حالت میں بھی ہزار مورچے سنبھالنے تھے۔جن میں سے ایک مورچہ،نوخیز ذہنوں کی تربیت کا مورچہ بھی تھا۔کمال خان نے بھی یہی کرنا تھا۔

صاحبزادہ دراصل اپنی پسند سے استاد نہیں بنے تھے۔وہ وکیل تھے۔مگر اپنے نیک اعمال کے باعث یہاں اسلامیہ کالج میں پٹخ دیے گئے تھے۔اور اگر وہ وکیل رہتے تو کمال خان، سائیں کمال خان کیسے بنتا،عبداللہ جان کی تربیت کون کرتا؟۔

ہوا یوں کہ صاحبزادہ ادریس علیگڑھ سے وکالت پاس کر کے آئے تھے۔اور یہاں آ کر وکالت شروع بھی کی تھی۔پشاور کے قصہ خوانی بازار میں اوپر کی منزل پر ایک دکان لی، دکان میں

خوبصورت فرنیچر ڈالا اور زبردست کتابیں سجا دیں۔

ایک دن ایک موکل قتل کا مقدمہ لے کر وکیل صاحب کے پاس آیا۔اس نے صاحبزادہ کو اپنا پورا کیس سنایا۔صاحبزادہ نے اس کی روداد سن کر پوچھا؛

''تو گویا تم نے قتل کیا ہے؟''۔

''جی ہاں''موکل بولا۔

''اور مجھے تمھیں بری کروانا ہے؟''

''جی ہاں''

صاحبزادہ صاحب نے اپنی وکالت کی ساری کتابیں کھڑکی سے باہر پھینک دیں اور کہا؛

''میں جھوٹ نہیں بولتا''۔

اور ٹھیک نصف صدی بعد اس اپاہج وکیل کا مفلوج شاگرد (عبداللہ جان) لکھ رہا تھا؛''سچ کو ہمیشہ منظر عام پر لایا جائے تا کہ اہلِ بصارت اور انسان دوست لوگ اس سے واقف ہو کر سماج کی اصلاح کر سکیں''۔

جیسا کہ ذکر ہوا ہے کہ صاحبزادہ صاحب کا ایک بہت ہی مقبول اور خوبصورت ناول ''پیغلہ'' ہے۔انہوں نے اپنی ایک اور کتاب ''گلے وسوسے'' کو''انسانیت کے نام'' سے منسوب کیا ہے۔ان کی کتاب''باتور'' کا انتساب ہے؛''فکر کی آزادی کے نام''۔اسی طرح''د سہیل ستورے'' کے علاوہ ان کی شاعری کے دو اور مجموعے بھی ہیں؛گردابِ فکر،اور'سوز وساز۔

ان کی شاعری سوشلزم اور انسانیت کے حق میں ہے۔وہ نوآبادیاتی نظام کے سخت مخالف تھے۔صاحبزادہ صاحب سرمائے کی غلط تقسیم کی درستگی چاہتے تھے۔وہ ایک بہت ہی قوم پرست، اور انسانیت دوست مفکر تھے۔ان کے کلام میں جا بجا آپ کو زندگی سے بھرپور پیار نظر آئے گا،مقصد کی یکسوئی ملے گی،اور بھوک جہالت اور غلامی کے خلاف لڑنے کی ترغیب ملے گی۔

ان کی زبان بہت سادہ'بہت رواں ہے۔عمدہ،خالص،عام،سادہ اور مہذب زبان ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس بڑے آدمی کے اثر میں آنے سے قبل عبداللہ جان باقاعدہ ملاّ بن چکا تھا۔ نمازیں، بحثیں، کپڑوں کا ڈھب سب کچھ جماعتِ اسلامی والا ہو چکا تھا۔ اور اس کی مبارک ریش پانچ، چھ انچ لمبی تھی۔ وہ معدے کی تیزابیت اور بے خوابی کا شکار ہو گیا تھا۔ بے قراری، اخلاقی ٹھیکیداری، زہد و عبادت.....وہ تو پکا ملاّ بن گیا تھا۔

یہیں کالج میں مودودی صاحب لیکچر دینے آئے۔ سائیں کمال خان نے ان سے سوال کیا کہ: ''اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟''۔ سائیں اور جمالدینی کے بقول مودودی صاحب اُن کا تسلی بخش جواب نہ دے پائے۔ چنانچہ سائیں کمال خان کے لئے گویا یہ دروازہ حتمی طور پر بند ہو گیا۔

صاحبزادہ ادریس سے فلسفہ تو سیکھا ہی، لیکن اگر وہ انہیں معیشت کی نازک نازک شیطانیاں نہ بتاتے تو عبداللہ جان و کمال خان شاید وہ حتمی راہ اختیار نہ کرتے جو بعد میں اُن کا مقدر اور یہاں کے عوام کی خوش بختی بنا۔ انسانی زندگی (اور بالخصوص طبقاتی سماج) کے سارے آلام اسی معاشیات کی باریک موشگافیوں میں تو پنہاں ہیں۔ لفظ ''قدرِ زائد'' ہی تو وہ خبیث اصطلاح ہے جس نے پوری انسانی تاریخ میں آزادیِ ذہن و جسم کا گلا دبائے رکھا ہے۔ یہ گرہ صاحبزادہ نے کھول کر اپنے شاگردوں کے سامنے رکھی۔

اسلامیہ کالج میں اُن کے دوسرے استاد شیخ تیمور اس لئے اہم ہیں کہ انہوں نے اپنے شاگردوں کو برٹرینڈ رسل کی کتاب Religion & Science پڑھوائی۔

پشاور قیام کے دوران عبداللہ جان اور کمال خان کا کاجی صنوبر حسین اور عبدالرحیم پوپلزئی جیسی عظیم شخصیات کی زندگیوں اور ان کے سیاسی فکر سے بھی آشنا ہوئے۔

ہاسٹل میں ایک ہی کمرے میں رہنے والے یہ دو رفیق گریجوئیشن تک علم و بحث و بحث کے اس گہوارے میں جڑواں بھائیوں کی طرح عقل و خرد کے موتی چنتے رہے۔

واضح رہے کہ اس دوران دوسری عالمی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ قومی آزادی کی تحریکیں دنیا بھر میں چولیں مار رہی تھیں۔ ایک ہلچل بپا تھی۔ دنیا کی غلام قومیں ایک ایک کر کے سامراجی زنجیریں

توڑ رہی تھیں۔ آزادی کی دیوی جگہ جگہ جلوے دکھا رہی تھی۔ ایسے میں جوان ذہن ان بڑے اثرات سے کس طرح بچے رہ سکتے تھے؟! اُن کے روح و دل بدل چکے تھے۔ عوامی فلاح کے تلاطم نے روحوں میں ایک آگ سی بھڑکا دی تھی۔

لیکن سائیں نے بالخصوص معاشیات پڑھی اور اسی میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ لفظ ''منافع'' جیسی خبیث اصطلاح سے وہ وہیں تفصیل سے آگاہ ہوئے اور دنیا میں بے شمار ممالک کے سوشلسٹ بن جانے کی خبروں نے اس لفظ کی موت کو مزید قطعی بنا دیا۔ اس کے خلاف سائیں کمال خان ساری عمر لڑتے رہے۔

یہاں امتحان میں صاحبزادہ ادریس نے خوش ہو کر انہیں بہت اچھے نمبر دے دیے۔ ہوا یوں کہ سوال آیا کہ Why India is Poor?۔ تو جو نصابی باتیں اس زمانے میں موجود تھیں اُن میں یہ تھا کہ ''آبادی بڑھ رہی ہے، پیداوار میں اضافہ نہیں ہو رہا..... وغیرہ وغیرہ''۔ سائیں کمال خان نے یہ روایتی نصابی جواب نہیں لکھا۔ بلکہ اس پورے دائرے کو توڑ دیا اور ساری ذمہ داری جائیداد کی نجی ملکیت پر ڈال دی۔ یہ مدلل، بھرپور اور انوکھا جواب تھا۔ استاد نے تو اتنا خوش ہونا ہی تھا کہ ایک تو شاگرد نے اپنا ذہن استعمال کیا اور دوسرا یہ کہ اس نے جواب بھی دلائل پہ مبنی لکھا تھا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ روس کے عظیم اکتوبر انقلاب، دوسری عالمگیر جنگ اور فاشزم کے بارے میں سائیں کمال خان شیرانی کے سیاسی خیالات یہیں پہ تشکیل پا گئے۔

اسلامیہ کالج نے چار سال تک رحمت کے ان دو قطروں کو اپنے پیٹ میں پالا پوسا۔ اور 1945ء میں گریجوئیٹ کی ڈگری عطا کر کے ان کے لال و گوہر بننے کی تصدیق کر دی۔

تحصیل علم سے فارغ ہو کر یہ دونوں دوست ڈیرہ اسماعیل خان کے راستے کمال خان کے گاؤں چلے آئے۔ راستے میں ڈیرہ اسماعیل خان میں کمال خان شیرانی ایک نائی کو پکڑ لایا اور یوں ماما جمالدینی کو دوبارہ ''انسان'' بنا دیا گیا۔ (دوستی نہ ہوتی تو یہ تو بہت بڑا جرم ہوتا!!) اور جنگل دیوتا کی سرزمین شنہ پونگہ میں کافی دن گزارنے کے بعد یہ دونوں دوست زندگی کے اگلے زینے پر قدم رکھنے نکل پڑے۔

سرکاری افسری

سائیں کمال خان اور عبداللہ جان دونوں کو نائب تحصیلداری کی نوکری ملی۔ سائیں، گلستان میں توبہ اچکزئی کے نائب تحصیلدار متعین ہوا تھا۔ جوانی کے دن تھے، سینے میں علم تھا اور کچھ کر گزرنے کی لگن تھی۔

اس زمانے کی اس کی تصویریں دیکھیں تو وہ ہندوستانی فلموں کا ہیرو لگتا ہے۔ بال بنے ہوئے، شیو کیا ہوا، تھری پیس سوٹ اور پھر وہ کسی راجا کی طرح پائپ پیتا تھا۔ ماما عبداللہ جان بتاتا ہے کہ وہ نہایت ہی قیمتی تمباکو استعمال کرتا تھا جس کی خوشبو ہی پاس کے لوگوں کو متاثر کرتی تھی۔

جناب اکبر اچکزئی کے بقول؛ ''وہ اچھے خیالات کا مالک تھا، ہر خاص و عام کے ساتھ بے تکلفی اور رواداری سے پیش آتا۔ وہ روشن خیال، انسان دوست افسر تھا''۔

ان تمام دوستوں کو شکار کا بھی بہت شوق ہوا کرتا تھا۔ سائیں کمال خان جہاں بھی افسر رہا، پہاڑوں پہ پہاڑی بکروں دنبوں، ہرنوں کا شکار بھی کرتا رہا۔ شہری لوگوں کے لئے یہ انوکھی بات ہو تو ہو، مگر شیرانی جیسے قبیلے کے نوجوان کے لئے شکار تو روزمرہ کا معمول ہوتا تھا۔ یہ صرف اُس کا شوق

نہ تھا بلکہ اُن کے آباؤ اجداد کی طرف سے وراثت میں ملا ہوا کام بھی تھا۔ شکار ہمارے آباو اجداد کی خوراک کا ایک بہت بڑا ذریعہ رہا۔ ابتدائی انسان کی بھوک کے لئے فطرت کا مداوا!!

کمال خان شیرانی نائب تحصیلدار تھا۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری عالمی جنگ اپنے اختتام کو تھی۔ اس عالمی جنگ نے ایک طرف غربت و افلاس لا گو کر دیا تو دوسری طرف خوفناک انسانی ذبیحہ اور ایٹمی ہتھیاروں کے اندھا دھند استعمال کی سامراجی خصوصیت ظاہر کر دی تھی۔ مگر ساتھ میں اِس عالمی جنگ نے قومی آزادی اور سوشلزم کی بے شمار کامیابیوں کے در کھول دیے۔ قلات، پاکستان، ہندوستان اور نیپال سمیت بے شمار ممالک نے قومی آزادی حاصل کر لی۔ سوشلزم کئی ممالک کے ریاستی نظریہ کا مقام حاصل کر چکا تھا۔ بالخصوص ہمارا پڑوسی چین ماؤزے تنگ کی قیادت میں عوامی انقلاب کے نتیجے میں سوشلسٹ ہو چکا تھا۔ دنیا میں ہر جگہ سماجی انصاف اور برابری کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ اور خود یہاں ہمارے وطن میں آزادی، انصاف اور برابری کی مقبول ترین تحرکوں کو زبردست تقویت ملی۔

اور یہی وہ زمانہ تھا جب اس نوجوان کو محبت ہوگئی۔ اور ایک عام دوشیزہ اُن کے لئے حسن و کشش کی وینس بن گئی۔ ہمیں اِس سپارٹیکس کی ''ورینیا'' کا مفصل حال معلوم نہیں اس لئے کہ سائیں نصف صدی قبل کے اس وقوعے کا تذکرہ ایسے کرتا تھا جیسے عبدالقدیر خان ایٹم بم کی ایجاد کو چوری چوری اِدھر اُدھر سمگل کر رہا ہو۔ شرمائے شرمائے، لجائے لجائے..... ہمراز عبداللہ جان تو کمال خان کی محبوبہ کا ریلوے سٹیشن اور اُس خاتون کا نام بھی بتاتا ہے مگر میرا مرتبہ وہ نہیں ہے۔ اور تحریر میں تو بالکل پیرومرشد کی منع ہے۔

مگر ایک طرح کا اطمینان، ایک طرح کا احساسِ تکمل!! جوانی تو نام ہے، محبت کا، عمل کا، سوشلزم کا۔ کمال خان بھوکی اور بیمار انسانیت کے دکھ سے تو پہلے آشنا ہو چکا تھا، سوشلزم سے وابستگی پہلے ہی حتمی بن چکی تھی، اب محبت کے فراق و وصال کی حساس آنکھ مچولی کا ذائقہ بھی نصیب ہوا۔ شخصیت کی تکمیل کے سارے ذرائع عطا ہو چکے تھے۔

پانچ برس تک نائب تحصیلداری کرنے کے دوران سائیں نے سماجی کرب کے بارے میں جو کچھ پڑھ رکھا تھا، اب وہ اِن کے سامنے رونما ہو رہا تھا۔ اس نے ہر گھڑی محسوس کیا کہ عوام الناس دکھوں کے گڑھے میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اِس نظام کے خلاف اتنی بڑی افسری کے باوجود کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ بلکہ الٹا یہ افسری اس نظام کو برقرار رکھنے میں مددگار بن رہی تھی۔ اسے اندازہ ہوا کہ افسری اس کی طبیعت اور مزاج کے خلاف ہے اور اب مزید اسے جاری رکھنا اس کے بس میں نہیں ہے۔ ہر طرف ظلم و جبر اور بھوک کی حکمرانی تھی۔ ایک وسیع خلفشار جو گھر کی چار دیواری سے لے کر کرہِ ارض کی بے کراں وسعتوں تک ہر سو پھیلا ہوا تھا، ایسا ہی جیسا کہ حافظ کے زمانے میں تھا؛

ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم
ہر کسے روزِ بہی می طلبد از ایام
مشکل این است کہ ہر روز بتر می بینم
ابلہان را ہمہ شربت ز گلاب و قند است
قوتِ دانا ہمہ از خونِ جگر می بینم
اسپِ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالاں
طوقِ زرین ہمہ در گردنِ خر می بینم
دختراں را ہمہ جنگ ست و جدل باما در
پسران را ہمہ بد خواہِ پدر می بینم
ہیچ رحمے نہ برادر بہ برادر دارد
ہیچ شفقت نہ پدر را بہ پسر می بینم
پند حافظ بشنو برو نیکی کن
زانکہ ایں پند بہ از دُرو گہر می بینم

(یہ کیسی خرابی ہے جو میں چاند کی گردش میں دیکھ رہا ہوں۔ تمام عالم فتنہ وفساد سے بھر گیا ہے۔ ہر شخص اچھے ایام کا متلاشی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہر نیا دن پچھلے روز سے خراب ہے۔ جاہل شربتِ گلاب پی رہے ہیں اور عاقل اپنا خونِ جگر۔ عربی گھوڑے پر لکڑی کا پالان ہے اور گدھے سونے کا ہار پہنے ہیں۔ بیٹیاں ماں سے لڑ رہی ہیں اور بیٹے باپ کو زخمی کر رہے ہیں۔ بھائی کو بھائی پر رحم نہیں آتا اور باپ کو بیٹے سے محبت نہیں رہی۔ اے خواجہ حافظ کی نصیحت سُن، جا اور نیکی کر اس لئے کہ اس نصیحت کو موتی اور گوہر سے بہتر دیکھتا ہوں)۔

حالات تو خیر آج بھی ویسے ہی ہیں۔ مگر' تاریخی مصیبت یہ رہی ہے کہ لوگوں کی اکثریت اس شور اور برائی سے لڑنے کے بجائے محض اِس کا رونا روتی رہتی ہے۔ ہر شخص اسی فتنہ وفساد کی اپنی آپ بیتی سنا رہا ہوتا ہے۔ ہر اخبار، ہر چینل ''کرپشن کرپشن'' کی جگالی کرتا رہتا ہے۔ مگر تماشبین کی طرح باہر کنارے پہ رہ کر، اندر کودتا کوئی نہیں ہے۔ بس ہر شخص باہر کھڑے کھڑے لاتعلق انداز میں اِس محشر پہ تبصرے کرتا رہتا ہے۔ یا پھر ''خود کو ٹھیک کرو سب ٹھیک ہو جائے گا'' کی سڑاند بھری تبلیغیں کرتا رہتا ہے۔

مگر کمال خان ہمارے خطے کے اُن چند زیرک و دانا اور سچے انسانوں میں سے تھا جنہوں نے رونا دھونا اور زخم نمائی سے ہٹ کر برائی کے اس سارے نظام سے ٹکر لینے کا فیصلہ کر لیا.....اور وہ فیصلہ تو ازل سے موجود ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ آج بھی یہی سوال' بقول نصرت صدیقی ہمارے سامنے ہے؛

ایک ظلم کرتا ہے' ایک ظلم سہتا ہے
آپ کا تعلق ہے کس گھرانے سے

کمال خان اور اس کے دوستوں کو بقول لینن؛ ''سخت حقیقتوں' دھوکے باز فطرتوں، شیریں جھوٹوں، ٹوٹے وعدوں، دوغلے چہروں، دلکش لفظوں، پیارے احساسوں' کرخت سچائیوں، تلخ رویوں، جھوٹے بیانوں، منافقانہ لہجوں.....'' کے اپنے تجربات سے اندازہ ہوا کہ ایک انقلابی

تحریک کے بغیر کوئی راہ نہیں، کوئی نجات نہیں..... اور یہ انقلابی تحریک تو بنانی پڑتی ہے، اس کے لئے کام کرنا پڑتا ہے، محنت کرنی پڑتی ہے اور وقت وتوانائی و مال خرچ کرنا پڑتا ہے۔

چنانچہ دفتری دربانوں، آرام دِہ کرسیوں، کروفر جاہ وجلال، دوروں اور دولت، فانوسوں اور مئے جاموں سے دور، بہت دور عوام الناس میں جانے کا فیصلہ ہوا۔ حاکم کے بطور نہیں بلکہ برابر کے انسان کے بطور..... باجماعت نوکریاں چھوڑ دینے کا فیصلہ ہوا۔

دوستوں، عزیزوں، اور گھر والوں کی بے پناہ مخالفت کے باوجود کمال خان نے دوستوں میں طے شدہ منصوبے کے تحت سب سے پہلے نائب تحصیلداری کے عہدے سے استعفیٰ دیا۔ کہتے ہیں کہ ان کا استعفیٰ سماجی ناانصافی کے خلاف ایک طویل احتجاجی مضمون کی صورت میں تھا۔ (میں نے بہت ڈھونڈا مگر اُس کے استعفے کی کوئی نقل میسر نہ ہوسکی۔ کاش کہ یہ خوبصورت دستاویز مل جائے)۔

کچھ عرصہ بعد نائب تحصیلدار عبداللہ جان جمالدینی نے بھی استعفیٰ دیا۔ وہ استعفیٰ طویل مضمون کی صورت نہ تھا بلکہ بہت مختصر الفاظ میں احتجاج کرتا ہوا استعفیٰ تھا۔ اسے سائیں ہی نے لکھا تھا۔ کافی عرصہ بعد نائب تحصیلدار بہادر خان بنگلزئی بھی ملازمت سے مستعفی ہوا۔ وہ کوہلو میں متعین تھا اور سائیں خود مستعفی ہونے کے بعد نائب تحصیلدار کے بجائے صرف کمال خان کے بطور کوہلو میں اُس کا مہمان ہوا تھا۔ اس طرح کمال خان نے 1950ء کی دہائی کے بعد ابتدائی برسوں میں مری علاقہ دیکھا تھا۔ (اور پھر 1980ء کی دہائی میں دوسری اور آخری بار وہ میرے بھائی کی شادی پہ مری علاقہ آیا)۔

اپنے استعفیٰ کے دن سے لے کر اپنی موت کے دن تک سائیں نے بیوروکریسی سے اپنی نفرت کو کامیابی سے جاری رکھا اور اس میں مسلسل اضافہ کیے رکھا۔ کمال خان اسٹیبلشمنٹ سے حقارت کی حد تک نفرت کرتا تھا۔ خواہ وہ ون یونٹی ہو، وفاقی ہو، صوبائی ہو، ضلعی ہو..... یا اپنی سیاسی پارٹی کی ہو۔ وہ پارٹی بیوروکریسی کو گورباچوف کے لفظ ''اپریٹس چک'' سے پکارتا تھا۔ اور بیوروکریسی والے ڈکشن ''ابھی ہوجائے گا، ابھی کرلوں گا.....'' پر پارٹی اہلکاروں کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔

لٹ خانہ

یکے بعد دیگرے ملازمت چھوڑ دینے کے بعد یہ تحصیلدار لوگ اپنے منصوبے کے تحت کوئٹہ میں جمع ہوئے۔ انہوں نے مارچ 1950ء میں بلوچی سٹریٹ کوئٹہ میں (ایک کمرے پر مشتمل) ایک ''مکان'' کرائے پر لے لیا۔ بغیر اردلی کے، بغیر نوکر چاکر کے، بے بجلی کے، یہ ''بنگلہ'' ان لوگوں کا گھر، بیٹھک، لائبریری سب کچھ تھا۔ خود ہی جھاڑو دینا، خود کھانا پکانا اور خود ہی اپنے کپڑے دھونا۔ مکمل طور پر ڈی کلاس۔ عام لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا' ان کے دکھ درد میں شریک ہونا اور انہیں علم و شعور پہنچانا ان لوگوں کا روز کا معمول ٹھہرا۔

اِن ''لٹ'' یعنی بے غم، اور بے روزگاروں کے اس مکان کا نام لٹ خانہ پڑا۔ اور تحریک کا نام ''لٹ خانہ تحریک''۔ یہ ایک طرح سے بلوچستان میں ترقی پسندی اور روشن خیالی کی تحریک تھی۔ یہاں انقلابات کی تاریخ پڑھی جاتی تھی، پڑھ کر بحث کی جاتی تھی۔ بحث کر کے لکھا جاتا تھا، لکھ کر کے چھاپا جاتا تھا، چھاپ کر کے بانٹا جاتا تھا۔ یہاں روشن فکر ادب پڑھا جاتا تھا۔ یہاں انسانی نجات کی راہیں ڈھونڈی جاتیں۔ یہاں انفرادیت کو دفن کیا جاتا اور اجتماعیت کو ''نازینک'' سنائے جاتے۔ ظاہر

ہے کمال خان شیرانی ہی اس کا دانشور لیڈر بنا۔ ماما عبداللہ جان کے بقول؛

''لٹ خانہ کے مردِ گفتگو یعنی ترجمان کمال خان ہی ہوتے تھے''۔

ماما اپنی کتاب ''لٹ خانہ'' میں مزید لکھتے ہیں کہ؛ ''کمال خان کی پرکشش شخصیت سب کو متاثر کرتی۔ جو ایک مرتبہ لٹ خانہ آتا تو ذہنی اور جذباتی طور پر اس سے منسلک ہو جاتا''۔

مگر سائیں کمال خان خود ٹک کر یہاں بیٹھتا نہ تھا۔ وہ وقفے وقفے سے اپنے علاقے کا چکر لگاتا اور وہاں کی معروضی صورتحال کا جائزہ لیتا۔ واپس آ کر ہم خیالوں سے بحث کرتا اور وہ لوگ کام کرنے کا طریقہ طے کرتے۔ چنانچہ کمال خان ہی نے یہ تجویز دی کہ اپنے اپنے علاقوں میں عوامی کمیٹیاں بنائی جائیں تاکہ لوگ خود اپنے مسائل پر بحثیں کر سکیں اور متفقہ فیصلے کر سکیں۔ اور اس طرح کی سب سے پہلی کمیٹی وہ خود اپنے علاقے میں بنا کر آیا۔..... کس قدر بصیرت بھری بصارت تھی اُس شخص میں!!

لٹ خانہ کے دوسرے ساتھیوں نے بھی سائیں کمال خان کی تجویز پر اپنے اپنے حلقہِ اثر والے علاقوں میں وہاں کے حالات کے مطابق مقامی کمیٹیاں تشکیل دینے کا فیصلہ کیا تاکہ وہاں روشن فکری اور بشر دوستی کا ان کا کام منظّم انداز میں چل سکے۔ چنانچہ نوشکی اور اسپلنجی میں ایسی کمیٹیاں بن گئیں اور کچھ کام شروع ہوا۔

روشن فکر نظریات کے پرچار کے لئے ہمیشہ سے کاغذ قلم، پمفلٹ کتابچہ، کتاب اور کتابوں کی دکان کی ضرورت پڑتی ہے۔ اِن دوستوں کو بھی احساس ہوا کہ پروگریسو لٹریچر کی ایک دکان کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ کتابوں کی ایک دکان کھولی گئی۔ کمال خان کے تخلیقی ذہن نے اس کا نام ''فی الحال اسٹیشنری مارٹ'' رکھا۔

شروع شروع میں اس میں بچوں کے سکول کی کتابیں کاپیاں وغیرہ رکھی گئیں۔ مگر کچھ عرصہ بعد اس میں باقاعدہ مارکسزم کی کتابیں آئیں۔ اس ''کاروبار'' کے لئے سات سو روپے کی رقم سائیں کمال خان نے اپنے ایک عزیز سے قرض لے کر فراہم کی۔ دکان پر ایک عدد سرخ پرچم

لہرایا گیا۔

اپنے نظریات کا پرچار کرنے کے لئے بلوچی زبان کے ادیبوں اور دانشوروں کی ایک تنظیم بنائی گئی؛ ''بلوچی زبان و ادبِ دیوان''۔ اسی طرح لٹ خانہ کے احباب کے فیصلے کے مطابق پشتو کے ادیبوں شاعروں کی ایک تنظیم قائم کی گئی جس کا نام ''پشتو ٹولی'' رکھا گیا۔ یہ تنظیم پشتو زبان و ادب کی خدمت، تحفظ اور ترقی کے لئے قائم کی گئی۔

ایک ماہوار رسالہ نکالنے کا فیصلہ ہوا۔ اِن دوستوں کی طرف سے ''سوب'' کے نام سے ایک بلوچی رسالہ نکالنے کی اجازت دینے کی درخواست دی گئی۔ مگر سرکار نے اس درخواست کو مسترد کر دیا۔ اس لئے کہ وہ اِن لوگوں کو خطرناک سمجھتی تھی۔ تب لٹ خانہ والوں نے ''پشتو ٹولی'' کی طرف سے کمال عقلمندی سے 1953ء میں سائیں کمال خان کے نام سے ایک رسالے کے ڈیکلریشن کی درخواست دی۔ چونکہ سائیں زیادہ تر اپنے گاؤں میں رہتا تھا اس لئے کوئٹہ کی پولیس اس سے زیادہ واقف نہ تھی۔ اس طرح پانچ چھ ماہ کے بعد ''پشتو'' ماہنامہ کا ڈیکلریشن حاصل ہو گیا۔ اور اسے شائع کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ سائیں کمال خان شیرانی پبلشر اور خدائیداد اس کا ایڈیٹر بنا۔ اس رسالے میں اُس وقت کا جدید ترین مواد چھپتا تھا۔

پشتو کے اس اولین شمارے میں محترم میر عبداللہ جان جمالدینی کا مضمون ''پشتو ادب'' بہت تعریف کے لائق تھا۔ میر صاحب پشتو کے ساتھ بہت محبت رکھتے ہیں۔ ان کا پشتو میں یہ اولین مضمون بہت شاندار اور کامیاب کوشش تھی۔

پہلے شمارے کا اداریہ ''حال احوال'' کے عنوان سے ہے جو سائیں کمال خان نے لکھا تھا (اس نے زندگی بھر بس یہی ایک اداریہ لکھا تھا)۔ اس کی ابتداء ہی خوبصورت فقروں سے ہوتی ہے۔

اسی اداریہ کے نیچے سیاہ چوکھٹے میں یہ تحریر تھی؛

''امریکی ظالم حکومت نے 19 جون 1953ء کو دو بے گناہ انسانوں کو بجلی کی کرسی سے قتل

کر دیا۔ بیوی اور شوہر۔ ایتھل اور جولیس روزنبرگ تین سال قبل اس شک پہ پکڑے گئے تھے کہ انہوں نے ایٹمی راز ایک غیر ملک کو پہنچائے۔ کوئی معقول چیز ایسی نہیں جو ان کا یہ جرم ثابت کرے۔ کچھ روز قبل جولیس کی ماں نے لوگوں کو بتایا؛ ''میں جانتی ہوں وہ بے گناہ ہیں۔ جولیس نے مجھے بتایا کہ ''میں بے گناہ ہوں۔ ہم نے کچھ نہیں کیا''۔ دنیا کے سارے انسانوں نے درخواست کی تھی کہ ان پر از سرِ نو مقدمہ چلایا جائے۔ مگر امریکی حکمرانوں پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ امریکی وحشی ہمیشہ بے گناہ انسانوں کو قتل کرتے ہیں۔ یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔

''اے امریکی ظالم استعماریو! ایتھل اور جولیس کی موت تمہاری موت ہے، وہ زندہ ہیں ..... جب تک یہ دنیا موجود ہے اس وقت تک اُن کے نام انسانوں کے دلوں میں امانت کے بطور رکھے ہوں گے..... تمہیں مرگی کا مرض ہے..... تم نے خود اپنے گلے پر چھری رکھ دی ہے۔ آج تم نے ابراہم لنکن کی جمہوریت کا جنازہ نکالا ہے''۔

مندرجہ بالا دو پیراگراف یہاں اس لئے نقل کیے گئے ہیں تا کہ ہمیں اندازہ ہو سکے کہ لٹ خانہ تحریک کے لوگوں کی وابستگی کیا تھی، اپنے نظریے سے وابستگی کی سنجیدگی کتنی گہری تھی اور وہ کس قدر بین الاقوامیت پسند تھے۔

واضح رہے کہ ایتھل اور جولیس روزنبرگ امریکی کمیونسٹ تھے۔ یہ دونوں طالب علمی کے وقت سے وہاں کی ینگ کمیونسٹ لیگ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جولیس روزنبرگ الیکٹریکل انجینئر ہو گئے اور ایتھل شپنگ کمپنی میں تھیں۔ ابلیس امریکہ کے اندر ایک ابلیسِ اعظم پیدا ہوا۔ وہ تھا سینیٹر جوزف میکارتھی۔ اُس شخص کی کمیونسٹ دشمنی عروج پہ تھی۔ پوری امریکی انتظامیہ اس کمیونسٹ دشمنی میں باولی ہو چکی تھی۔ اسی میکارتھی کی قیادت میں خصوصی کانگریسی کمیٹیاں امریکہ سے کمیونسٹ ہمدردوں کی جڑیں اکھاڑنے کیلئے متنازعہ تحقیقات کر رہی تھیں۔ دنیا بھر میں ایک ہسٹیریا پھیل چکا تھا اور ہر ملک اور ہر گوشے میں کمیونسٹوں کی شامت آ چکی تھی۔

جس کسی پر کمیونسٹ ہونے کا شک ہوتا تو اسے اعترافی بیان دینے پہ مجبور کیا جاتا اور

پھر اسے وعدہ معاف گواہ بنا کر دوسرے کمیونسٹوں کی شناخت پر لگا دیا جاتا۔ الزام تراشیوں کی ایک وبا پھوٹ پڑی۔ لوگ پکڑے جاتے۔ انہیں نوکریوں کے لئے بلیک لسٹ کیا جاتا۔ اسی پاگل پن میں ان دونوں کمیونسٹوں پر جاسوس ہونے کا الزام لگا۔ چنانچہ وہاں پاکستانی عدالتوں جیسی عدالت لگی۔ اس جھوٹے کیس کے خلاف دنیا بھر کے باضمیر لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ عالمی شہرت یافتہ مصور پکاسو، پوپ، البرٹ آئنسٹائن، جان پال سارتر، نیلسن الگرین..... کس کس کا ذکر کیا جائے۔ جلسے جلوس سیمینار قرار دادیں۔

مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ انہیں سزائے موت ہو گئی۔ اپیل سپریم کورٹ گئی۔ مسٹر د۔ صدر ٹرومین نے دنیا کی اپیلیں سننے سے اپنے کان بند کر دیے۔ اٹارنی جنرل نے آخری بار پیشکش کی کہ وہ اَن کیے جرم کا اقرار کر لیں اور اپنی جان بخشی کروائیں۔ اگلے دن دونوں میاں بیوی نے اسے جواب دیا؛

''.....انصاف اتنا نیچ نہیں جسے سب سے بڑی بولی لگانے والے کے ہاتھ بیچا جائے۔ اگر ہمیں سزائے موت دی گئی تو یہ بے گناہ لوگوں کا قتل ہوگا اور سارا شرم امریکہ کی حکومت کے لئے ہوگا۔ خواہ ہم زندہ رہیں یا نہ رہیں تاریخ ریکارڈ کرے گی کہ ہم اس ملک کی تاریخ میں سب سے خوفناک جھوٹی صورتحال کا شکار ہوئے تھے''۔

اپنی موت سے قبل والی رات ایتھل نے اپنے وکیل امانوئیل بلوچ کو ایک مختصر خط لکھا؛

''میں اپنا پورا دل ان لوگوں کے لئے بھیجتی ہوں جو مجھے پیار کرتے تھے۔ میں اکیلی نہیں ہوں۔ اور میں وقار اور فخر سے مروں گی، یہ جانتے ہوئے کہ میں اور میرا شوہر تاریخ کے ہاتھوں بری ہوں گے۔ آپ یہ خیال رکھیں کہ ہمارے نام درخشاں رہیں اور دروغ گوئیوں سے مبرا رہیں۔ بالکل اسی طرح آپ نے مکمل یکسوئی کے ساتھ اور اسی طرح فیاض رہیں جس طرح آپ نے اُس وقت کیا جب ہم زندہ تھے..... آپ نے ہر کام کیا جو کیا جا سکتا تھا۔ ہم امریکی فاشزم کا پہلا شکار ہیں''۔

اپنی موت سے ذرا قبل میاں بیوی نے اپنے دو کمسن بیٹوں کو آخری خط لکھا؛

''19 جون 1953ء

عزیز ترین دل کے ٹکڑو اور میرے سب سے قیمتی بچو!

''ابھی آج صبح ہی لگتا تھا جیسے ہم بہر حال ایک بار پھر مل جائیں گے۔ اب جب کہ ایسا نہیں ہوسکتا، میں چاہتی ہوں کہ تم لوگ وہ سب کچھ جان جاؤ جس کا مجھے پتہ چلا ہے۔ بدقسمتی سے میں صرف چند سادہ الفاظ لکھ سکوں گی؛ باقی باتیں خود تمہاری زندگی تمہیں سکھائے گی، بالکل اُسی طرح جس طرح میری زندگی نے مجھے سکھائی ہیں۔

''پہلے پہل، تم یقیناً ہمارے لئے زاروقطار روؤ گے، مگر تم اکیلے ماتم نہیں کرو گے۔ وہ ہمارا دلاسا ہے اور اسے بالآخر تمہارا بننا ہے۔

آخر کار تم بھی یقین کرنے لگو گے کہ زندگی جینے کے قابل ہے۔ تسلی رکھو کہ حتیٰ کہ اب بھی، جب ہمارا انجام آہستہ آہستہ قریب آ رہا ہے، ہم مکمل یقین کے ساتھ یہ جانتے ہیں۔ ایسا یقین، جو کہ قاتل کو شکست دے گا۔

ان دونوں کو 19 جون 1953ء کو ان کی شادی کی چودھویں سالگرہ کے موقع پر بجلی کی کرسی پر بٹھا کر قتل کر دیا گیا۔ چشم دید لوگوں کے بقول جولیس کی لاش کو قتل گاہ کی خونی کرسی پر سے نکالنے کے فوراً بعد ایتھل روزنبرگ کو لایا گیا، اس نے مرنے سے قبل اپنے ہمراہ آئی ہوئی میٹرن کی گال پہ نرمی سے بوسہ دیا اور خود کو موت کے حوالے کر دیا۔

تمہاری زندگیوں کو تمہیں یہ بھی پڑھانا ہوگا کہ اچھائی' برائی کے درمیان واقعی پروان نہیں چڑھ سکتی کہ آزادی اور وہ سب چیزیں جو زندگی کو واقعی اطمینان اور قابل قدر بناتی ہیں کبھی کبھی بھاری قیمت سے خریدنی پڑتی ہیں۔ پھر، اعتماد رکھو کہ ہم پرسکون تھے اور عمیق ترین تفہیم سے سمجھتے تھے کہ تہذیب ابھی تک اس نکتے تک ترقی نہیں کر چکی جہاں زندگی کو محض زندگی کی خاطر ضائع نہیں کرنا چاہئے اور یہ کہ ہم اس یقینی علم سے مطمئن تھے کہ ہمارے بعد دوسرے جاری رکھیں گے۔

ہماری خواہش ہے کہ ہمیں باہر تمہارے ساتھ اپنی زندگیاں گزارنے کی زبردست خوشی اور

مسرت مل جاتی۔ تمہارا والد جو کہ اِن آخری بھاری ساعتوں میں میرے ساتھ ہے اپنا دل اور جو کچھ اس میں ہے اپنے عزیز ترین بیٹوں کے لئے بھیجتا ہے۔ ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہم بے قصور تھے اور ہم نے اپنے ضمیر کو کبھی نقصان نہ دیا۔ ہم تمہیں اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنے سینوں سے لگاتے ہیں اور بوسہ دیتے ہیں۔

بہت محبت سے،

ابو اور امی

جُولی، ایتھل''

واضح رہے کہ رابرٹ تین برس کا بچہ تھا جب اس کی والدہ ایتھل اور والد جولیس کو ''قومی سلامتی'' کے نام پر گرفتار کیا گیا۔ اُن پر مقدمہ چلایا جاتا رہا۔ اور جب رابرٹ چھ سال کا تھا اور ابھی اس کے دانت بھی نہ ٹوٹے تھے کہ اس کی پیاری ماں کو بجلی کے کرنٹ لگا کر قتل کر دیا گیا اور یہی حشر اس کے والد کا ہوا۔ سینٹر میکارتھی کی کمیونسٹ دشمنی پورے ملک (بلکہ پوری دنیا) میں پھیل چکی تھی۔ ''کمیونسٹ غدار، باغی، اور جاسوس'' ماں باپ کے یہ یتیم بچے عزیزوں رشتہ داروں میں خوف کی وجہ سے ''اپنوں'' کا دستِ شفقت نہ پا سکے جنہیں خوف تھا کہ اِن بچوں کو اپنانے پہ وہ بھی کمیونسٹ قرار دیے جائیں گے۔

وہ دونوں یتیم کردہ معصوم پہلے ایک یتیم خانے میں رہے۔ بعد میں وہ اپنے والدین کے دوستوں کے ساتھ نیو جرسی میں رہے مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ کون ہیں تو بورڈ آف ایجوکیشن نے انہیں سکول سے باہر پھینک دیا۔

یہ دونوں بچے اپنے بچپن' لڑکپن اور نوجوانی کے ماہ وسال والدین کے سیاسی نظریات سے ناپسندیدگی کے سماج میں گزارتے رہے۔ دونوں اُس خوف، غصہ، اور تباہی پہ قابو پاتے رہے جو ننھے سے دماغوں میں ماں باپ کی ایسی دلخراش موت سے نقش ہو چکے تھے۔

ان دونوں پاک انسانوں کی سزائے موت نے دنیا بھر کے کمیونسٹوں اور انسان دوستوں کو

جھنجھوڑ رکھا تھا اور ہر جگہ عوام دوست ادیب و شاعر امریکی سامراج کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے تھے۔ فیض کی نظم ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' انہی دو اچھے انسانوں کی شہادت پر ہی تو ہے۔ فیض اُس وقت خود منٹگمری جیل میں سامراج دشمنی کے جرم میں پڑے سزا کاٹ رہے تھے۔ آیئے اِن شہید میاں بیوی پہ فیضؔ کا کلام دہرا کر ہم بھی اپنے ضمیر کی عاقبت بہتر کر لیں؛

''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے''

(ایتھل اور جولیس روزنبرگ کے خطوط سے متاثر ہو کر لکھ گئی)

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی،
تیری الفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علَم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے

کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

منٹگمری جیل 15 مئی 1954ء (فیض احمد فیض زنداں نامہ مکتبہ کارواں لاہور، صفحہ نمبر 76 تا 78)

درست بات ہے ..... ہم سب قتل گاہوں سے چُن کر چلنے والے'' عشاق کے قافلے'' سے ہیں۔ اور کمال خان اس قافلے کے آگے کے لوگوں میں سے تھا۔ لٹ خانے کا یہ نقطہ نظر اُن کی نظریاتی وابستگی کی وضاحت کرتا ہے۔ عالمی کمیونسٹ تحریک کے ساتھ اس کی وابستگی اور سخت محنت کی وجہ سے ہماری تحریکی تاریخ میں لٹ خانہ ایک روشن سنگ میل ثابت ہوا۔

اور واقعی کمیونسٹوں کے اِن بچوں کی زندگی نے انہیں بہت کچھ سکھایا۔ بڑے ہو کر دونوں بھائیوں نے مل کر اِس عذاب پر ایک کتاب لکھی؛ ''ہم تمہارے بیٹے ہیں''۔ (1975ء)۔ بعد میں بڑے ہو کر رابرٹ نے 2004ء میں ایک اور کتاب لکھی؛ ''خاندان میں ایک سزائے موت؛ ایک بیٹے کا سفر''۔ یہ اس سرگزشت کی روئیداد ہے جو کہ شخصی جرات کا عقل گھما دینے والا ایک سفر ہے۔ یہ دنیا کی تاریخ میں متنازعہ ترین مقدمات میں سے ایک کی دردناک 'ذاتی' اور ہلا ڈالنے والی کہانی ہے۔

رابرٹ جب بڑا ہوا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ تو بے شمار گم نام، اچھے اور سخی انسانوں کا مقروض ہے جن سے وہ ملا تک نہ تھا۔ وہ عظیم لوگ اُس کی حمایت میں جلسہ جلوس کرتے رہے، تقریریں کرتے رہے، دنیا کے دور دراز کونوں کھدروں میں سے لوگ اُن کے لئے لکھتے رہے بولتے رہے۔ انہی نجیب انسانوں کی اجتماعی کوششوں اور سخاوتوں کی برکت سے وہ دونوں بھائی' بچوں پہ مہربان ترقی پسند اداروں کے مددگار ماحول میں، پلے بڑھے اور ترقی کی۔ چنانچہ وہ اس فکر میں رہا کہ میں ان تمام انسانوں کا قرض کس طرح چکا دوں جن کی مدد سے میں زندہ بچ گیا اور بڑا ہو گیا۔ چنانچہ 1990ء میں رابرٹ نے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی؛: ''روزنبرگ فنڈ فار چلڈرن''۔ یہ فنڈ اُن بچوں کی مدد کرتی ہے جو اسی طرح کے عذاب سے گزر رہے ہوتے ہیں جن سے وہ خود بچپن میں گزرا تھا۔ ایسے بچوں کی مدد کرنا جن کے والدین بائیں بازو سے وابستہ ہوں اور عدالتی مقدموں میں الجھائے گئے ہوں۔.....کارواں ہے چلتا ہی رہے گا!!۔ کہاں امریکہ، کہاں بلوچستان۔ لٹ خانہ کا ترجمان رسالہ کمال خان شیرانی کی ایڈیٹری میں ہمیں اِس بین الاقوامی معزز قافلے میں شامل کیے ہوئے تھا۔ میں 2011ء میں اُس کمال خان کا تذکرہ ادب و احترام سے کر رہا ہوں جس نے 1954ء میں امریکہ کے جولی اور ایتھل کا تذکرہ کیا تھا۔ تعظیم و تکریم کا اولمپک مشعل!!

نہنگ اور چھوٹی نہر؟

لٹ خانہ کا یہ رسالہ اس قدر سنجیدہ ثابت اور مقبول ہوا کہ اس میں عبدالحئ حبیبی، عبدالرؤف بینوا، ہمیش خلیل، مسکین درانی اور عبدالصمد اچکزئی بھی لکھنے لگے۔ اس ماہنامہ کا پہلا شمارہ اگست 1954ء میں چھپا۔ یہ رسالہ روشن فکری اور ترقی پسندی کا گویا ترجمان تھا۔ پورے بارہ ماہ چلنے اور بارہ شمارے چھپنے کے بعد اگست 1955ء میں قربان علی اے جی جی کے دستخطوں سے اس پر پابندی لگ گئی۔

(مگر قربان جان! تمہارے قربان جاؤں۔ بھلا فکر کے سرسبز درخت کو بھی کبھی خزاں گہنا سکی ہے؟ آج تمہاری اے جی جی جیسی پھنے خانی کا کوئی ذکر نہیں کرتا، اور خود تمہارا نام ان بڑے انسانوں کی فکر کے نام کے طفیل آ رہا ہے، جس کا گلہ تم نے گھونٹا تھا۔ اے قربانو، اے اے جی جیو! فکر و دانش ہزار جڑوں والا پودا ہے، اس کا ہر حصہ الگ سے پودا بن سکتا ہے، تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے)۔

لٹ خانہ اپنا مشن مکمل کر چکا تھا۔ اب اِس مرکز کو تحلیل ہونا تھا۔ اور تحریکی دوستوں کو کوئٹہ شہر سے بہر حال نکلنا تھا۔ اُن کی نظریاتی پختگی اور ہم آہنگی کا مرحلہ مکمل ہو چکا تھا۔ اب ہر درخت کو الگ

الگ سایہ دار بنتا تھا اور اپنا اپنا تاکستان بسانا تھا۔ ہر شخص نے کوہِ سلیمان بننا تھا' عوام میں جانا تھا۔ (عوام میں جانے سے ہی تو شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے)۔

اور اس سب کے محرک بھی سائیں کمال خان تھے۔ لمبی چوڑی بحثوں میں الجھے بغیر انہوں نے ہی پہل کر دی۔ چنانچہ خوشحال خٹک کا یہ نہنگ (کمال خان) چھوٹی نہر چھوڑ گہرے دریا یعنی اپنے بڑے قبیلے شیرانی میں چلا گیا۔

شیرانی لوگ بلوچستان میں ژوب سے پانچ چھ میل مشرق سے لے کر صوبہ خیبر پختونخوا میں ڈیرہ اسماعیل خان تک کے وسیع علاقے میں رہتے ہیں۔ فطرت کے قریب' ہاؤ ہو سے بہت دور۔ یہ لوگ بہت چھوٹی مسرتوں پر جشن منانے اور نازک انسانی رشتوں کے تقدس کی حفاظت کرنے والے سادہ انسان ہیں۔ ان کی اپنی مخصوص پشتو ہے جو نہ وزیرستان کی پشتو کی طرح سخت ہے اور نہ قندھار والوں کی پشتو کی طرح مترنم۔ سائیں کا بعد کا ٹھکانہ یعنی سلیازہ تو میدان پہ ہے جہاں سائیں بہت بعد میں شفٹ ہوئے تھے وگرنہ بقیہ تقریباً سارا شیرانی قبیلہ پہاڑوں میں رہتا ہے۔

وہ سلیازہ میں اس لئے منتقل ہوئے تھے کہ وہاں شنہ پونگہ میں قبائلی دشمنیاں بہت تھیں۔ کمال خان قبائلی برادر کشی سے بہت نفرت کرتا تھا۔ اس نے نہ صرف اپنا آبائی علاقہ چھوڑا بلکہ وہ پوری زندگی قبائلی جھگڑوں کو بجھانے میں کوشاں رہا۔

سلیمان کوہ اسے دوسرے قبائل اور ثقافتوں سے بچائے ہوئے اس طرح اپنی آغوش میں رکھتا ہے جس طرح ماں نوزائیدہ بچے کو۔ چنانچہ شیرانی ثقافت و زبان دوسروں سے ملاپ میں نسبتاً کمزور ہے۔ سائیں کا کہنا تھا کہ پشتو زبان کے ممتاز سکالر جناب عبدالحئ حبیبی ان کے علاقے میں سے گزرے تھے اور وہ شیرانیوں کی پشتو کے خالص ہونے کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ پشتو زبان کے شیرانی لہجے کے ستھرے پن کی گواہی عبدالصمد اچکزئی بھی دیا کرتے تھے۔

سائیں پھر اُس علاقے سے مغرب کی جانب منتقل ہوئے اور ایک نیا گھر بسا لیا۔ جگہ کا نام ہے ''سلیازہ''۔ یہ ایک گزرگاہ ہے کاروانوں کی، ملاّ زئی، خروٹی، ناصر.....الغرض ہر خانہ بدوش

کارواں کا ہائی وے ہے سلیازہ۔ سائیں کا دروازہ کھٹکھٹانے والے زیادہ تر لوگ اس طرح کے سوال کرتے تھے: ''میرا سفید رنگ کا گدھا تو نہیں آیا یہاں؟''۔ ''میرا اونٹ غائب ہے دو دن سے' یہاں سے تو نہیں گزرا؟''۔ ہم بھی اپنی منزل کا پتہ معلوم کرنے وہاں جایا کرتے ہیں۔ قطب اچھا، قطب نما اچھا اور قطب کی تلاش میں سرگرداں روح بھی اچھی۔

1955ء میں شعور کے ازلی ساتھی، کمال خان عوام الناس کی فلاح اور فکری راہنمائی کے مختلف طریقے آزمانے لگے۔ عوام الناس کے اجتماعی شعور میں رچ بس کر ان کی تہذیبی اور فکری بڑھوتری کا صبر آزما کام کرنے لگے۔ انہوں نے اپنے گاؤں جا کر ایک کمیٹی قائم کی تاکہ گاؤں کے فیصلے اسی پنچائیت میں ہو سکیں۔ لڑائی جھگڑوں کے تصفیے' مقدمات کے فیصلے.....مگر سرکار کو عوامی صلح کی یہ عدالت اپنے نظام کے لئے خطرہ لگی۔ سازشیں ہوئیں اور یہ مقدس کام آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں انہوں نے سکول کھولا اور خود ٹیچری شروع کی۔ وہاں ظالم طبقات کے خلاف ڈرامے بھی پیش ہوتے رہے۔ پھر ایک ڈسپنسری بھی قائم کروائی۔ اسی طرح ہر سال یہاں ایک میلہ مویشیاں کا انتظام کیا۔ بعد میں انہوں نے ایک دیہی مدرسہ قائم کیا۔ یہ مدرسہ مانی خوا سے تقریباً نو میل کے فاصلے پر ''اوبوسر'' نامی مقام پر قائم ہوا۔ مدرسہ کے لئے فنڈ جمع کرنے والوں میں ان کا ساتھ، کمال دین کمال' صوفی نور محمد اور مولوی دین محمد شیرانی نے دیا۔ عوامی اشتراک اور ملکیت کی خاطر سائیں اس مدرسے کو چندے سے چلاتے رہے۔ عام لوگوں سے چندہ۔ الغرض کمال خان اپنے معاشرے کے دماغوں سے کٹورے بالٹیاں بھر بھر کر جہالت چُراتا رہا۔

مگر عصری تعلیم کی کمی کا شکار' یہ پسماندہ معاشرہ نہ تو شعور کی نزاکتوں کی نازبرداریاں جانتا تھا، اور نہ اس مشروب کے نوش کرنے کا ہنر۔ ملاّؤں کے بے پناہ اثر کو کسی بھی صورت کم کرنا ایک ہر کولیسی قوت کا تقاضا کرتا تھا جبکہ سائیں جیسے لوگ تو محض ابتدا کر چکے تھے۔ شعور و عقل کی دوائی کی مقدار اور رفتار کے بارے میں شاید سائیں نے خیال نہ رکھا۔ بہرحال شعور کا مشروب تریاق نہ بن سکا۔ رجعتی عناصر اور حکومتِ وقت نے مدرسہ کی روشن خیال' انسان دوست اور ترقی پسند پالیسیوں کو اپنے

لئے خطرہ جانا۔ چنانچہ سرکار نے مدرسہ چلانے والوں کے گھروں پہ چھاپے مارنے شروع کئے، وارنٹ گرفتاری جاری کئے۔ اس طرح تنگ کرتے کرتے مدرسہ کے اساتذہ تدریس سے پیچھے ہٹے، مالی مشکلات نازل ہوئیں اور یوں مدرسہ کو بند کرنا پڑا۔

سائیں نے اپنے پس ماندہ خطے میں روشن فکری کی تحریک کے لئے قوم دوست پلیٹ فارم کو موزوں سمجھا۔ وہیں وہ زندگی بھر رہے۔ اور کامیابی سے اپنے فکری دوستوں کو سامراج دشمنی اور رجعت مخالف سمت دے گئے۔ کیا کیا چیلنج آئے مگر سائیں تحریک میں موضوعی موقع پرستیوں سے لے کر معروضی ٹھوکروں تک سے بد دل نہ ہوتے ہوئے اپنے پیروکاروں کو استقامت کے ساتھ روشن فکری سے لگائے رہے۔

سائیں کمال خان لٹ خانے کے اپنے پرانے فکری رفیقوں کے ساتھ مضبوط طور پر جڑے رہے اور لٹ خانے والے کمال خان کے دوست اُن سے اس قدر متاثر تھے کہ سردار بہادر خان بنگلزئی نے اپنے ایک بیٹے کا نام کمال خان رکھا تھا جو آج کل بنگلزئی قبیلے کے سردار ہیں۔ سائیں دنیا کے دیگر مظلوموں محکوموں کے ساتھ فکری ہم بستگی برقرار رکھے رہے، اور اپنے عوام کو منظّم کرتے رہے۔

کمال خان سے میری شناسائی

1972ء کے اواخر اور 1973ء کے اوائل میں، میں سائیں کمال خان کے نظریاتی کارواں میں شامل ہو چکا تھا۔ جب بنگلہ دیش بنا تو بھاشانی نیپ نے اپنا نام بدل کر پاکستان سوشلسٹ پارٹی رکھ لیا۔ میں بلوچستان کے اِن دوستوں کے قافلے میں اِس موقع پر آن ملا۔ سبی میں کالج کی تعلیم کے دوران میری دوستی کچھ ترقی پسند طلبہ سے ہو گئی تھی۔ جن میں قاسم نودہانی، اللہ داد لونی اور اکرم شاہ شامل تھے۔ لاہور سے ''عوامی جمہوریت'' نامی ہفت روزہ آتا تھا۔ یہ لوگ محنت کرتے تھے اور دوسرے طلبہ میں اپنے خیالات پھیلاتے تھے۔

میں بھی یہ خیالات قبول کر چکا۔ اور علم و شعور سمیٹ سمیٹ کر جلد ہی اِن میں ایک معتبر دوست کی حیثیت اختیار کر گیا۔

مجھے اکرم شاہ نے باضابطہ طور پر اس پارٹی میں شامل کر لیا۔ میں کتابیں پڑھتا رہا اور ہم خیال دوستوں سے ملتا رہا۔ یہ ایک سراسر نئی دنیا تھی۔ انہی دنوں اس پارٹی کے بلوچستان کے لوگوں نے خان عبدالصمد خان کی پارٹی میں شمولیت اختیار کی تھی۔

اکرم شاہ کی دوستی سائیں حسن خان سے تھی جو بلوچستان یونیورسٹی میں ڈپٹی رجسٹرار تھے۔ چونکہ حسن خان کا تعلق پشتونخواہ نیشنل عوامی پارٹی سے تھا اس لئے ہماری شناسائی بھی اس پارٹی کے لیڈروں سے ہوئی۔ چونکہ پشتونخواہ پارٹی میں نظریاتی اور تنظیمی طور پر عبدالرحیم مندوخیل ہی بہت محنت کرتے تھے' اس لئے ان سے قریبی تعلق پیدا ہوا۔ عبدالرحیم مندوخیل بلوچستان بھر میں سیاسی تعلیم دینے کے سب سے محنتی شخص رہے ہیں۔ رحیم صاحب جدلیاتی مادیت میں ایک لحاظ سے میری عمر کے بہت سارے دوستوں کے محترم استاد بنے۔ میں کئی کئی روز تک اُن سے لیکچر لیتا رہا۔ یہ لیکچرز گھوڑا ہسپتال کے سامنے ایک گلی میں واقع سائیں حسن خان کے کرائے کے مکان میں ہوا کرتے تھے۔ جہاں میں کئی راتیں بسر کرتا اور رحیم صاحب کے لیکچر سنتا۔

یہی رحیم صاحب اپنے دلائل میں بار بار سائیں کمال خان کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ اس طرح اس نام سے اچھی خاصی غائبانہ واقفیت ہوگئی۔ جب بالآخر ایک خوبصورت شام جناح روڈ کے ریگل ہوٹل میں بالمشافہ اس ہستی کو دیکھا تو ملتے ہی انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی؛

''میں اکثر آپ کا نام ساتھیوں سے سنتا رہتا ہوں۔ آپ خیر بخش کے کیا لگتے ہیں؟۔ میر عبداللہ جان کو جانتے ہیں؟''۔

ظاہر ہے میں اپنے محترم نواب اور سینئر سیاستدان خیر بخش کا قریبی عزیز نہ تھا اور اس وقت تک عبداللہ جان سے بھی واقفیت نہ تھی۔ بہرحال یہ شخص میرے دماغ کی اچھائی جانچنے کے خانے میں ''کلک'' کر گیا۔ اپنے فلسفے کی طرح میرے دل و دماغ پہ چھا گیا اور مجھے اس میں بہت زیادہ اپنائیت لگی۔

تم حیا اور شریعت کے تقاضوں کی بات کرتے ہو
ہم نے ننگے جسموں کو ملبوسِ حیا دیکھا ہے
تم نے دیکھے ہیں احرام میں چھپے ہزاروں ابلیس
ہم نے مئے خانے میں سو بار خدا دیکھا ہے

(صوفی بیدل)

سائیں کمال خان جب بھی کوئٹہ آتے تو ڈاکٹر خدائیداد کے پاس ٹھہرتے۔ اس طرح کوئٹہ دوروں کے موقع پر اُن کے ارباب کرم خان روڈ پہ ڈاکٹر خدائیداد کا گھر ہی ہمارا مسکن ٹھہرتا۔ وہ پندرہ بیس دن یہیں رہ کر واپس ژوب چلے جاتے اور دو تین ماہ بعد پھر آ جاتے۔ صبح سے لے کر رات گیارہ گیارہ بجے تک میں' سائیں اور ڈاکٹر خدائیداد اکٹھے رہتے۔ جہاں جانا اکٹھے جانا' جہاں کھانا اکٹھے جانا۔ دعوتیں' ہوٹلنگ' کتابوں کی خریداری..... ماما عبداللہ جان جب بھی یونیورسٹی سے فارغ ہو جاتے آن ملتے۔ چالیس برس کا یہی سلسلہ یہی وطیرہ رہا ہمارا۔ جب تک کہ خدائیداد اوپر چلے گئے اور پھر سائیں خود ہماری دنیا میں نہ رہنے کا فیصلہ کر گئے۔

اسی زمانے میں اس خطے میں ایک بہت بڑی تبدیلی آئی۔ بادشاہت والے افغانستان میں مساوات پر مبنی سماج والا انقلاب آ گیا۔ ایسے ایسے اقدامات ہونے لگے جن سے پورا ایشیا براہِ راست متاثر ہوا۔ لازمی اور مفت تعلیم، مفت علاج، جاگیرداروں کی زمین چھین کر اُس کی بے زمین کسانوں میں تقسیم، عورت کی خرید و فروخت بند، سود حرام..... غریبوں کی پوری دنیا اس انقلاب کی طرف ہمدردی اور یک جہتی سے دیکھنے لگی۔

مگر ظاہر ہے یہ جہاز رانی ہموار پانیوں والی تو نہ تھی۔ امریکہ نامی سامراج ہر عوامی اقدام کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لئے تو موجود ہے۔ یوں یہ انقلاب امریکی سازشوں، سعودی پیسوں اور ضیاالحقی آدمیوں سے زخمی ہونا شروع ہوا۔ افغان انقلاب کا برپا ہونا، زبردست انداز میں کامیاب ہونا، پھر ہچکولے کھانا اور بالآخر مٹ جانا..... ہر قدم زیر و بم کے زلزلے نازل کرتا ہوا۔ مگر سائیں کمال خان اور اس کے دوستوں کی فکر نے بلوچستان کے عمومی کارواں کو مستقل مزاجی کے ساتھ سامراج دشمن اور روشن فکر رکھا۔ کمال خان کی فکری قیادت میں یہاں کے لوگ انقلاب کے حق میں ہی رہے۔

نوجوان ڈاکٹر کی حیثیت سے ڈاکٹری کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی پسینے بہاتے ہوئے میں نے جب ہاؤس جاب مکمل کیا تو آٹھ دس ماہ نوکری کے بغیر پھرتا رہا۔ وارنٹ جو تھے۔

ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی (جو اس زمانے میں پی ایم اے، بلوچی ادب اور سیاست میں میرے سینئر کا رول ادا کر رہے تھے) کے مشورے سے میں کوئٹہ سے ''شارٹ'' ہو گیا۔ ایسے خطے میں جہاں انڈر گراؤنڈ رہنے کے لئے بلوچی چپل کی جگہ بوٹ پہننے لازمی تھے اور ایک دوست نے تو ڈانٹتے ہوئے کہا؛ ''ضیاء الحق حکومت سے روپوش ہو کر پنجاب آئے ہوئے ہو اور لباس وقطع وہی بلوچوں والا ہے تو یہ خود ہی دعوت دینا ہے گرفتاری کے لئے۔ جاؤ دھوتی پہن لو اور باہر نکلنا چھوڑ دو''۔ دھوتی میں نے سکول کے زمانے میں دُکی میں ایک بار پہنی تھی، جب سکول میں ایک ڈرامے میں میرا رول ایسا تھا جہاں دھوتی پہننی تھی۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ میرے سائنس ٹیچر حبیب صاحب اور پی ٹی آئی اقبال صاحب (جو اس ڈرامہ کے ہدایتکار بھی تھے) کتنی مشکلوں سے دھوتی پہنا کر مجھے ریہرسلیں کراتے تھے اور مجھے ایکٹنگ، ڈائیلاگ کی ادائیگی سے زیادہ دھوتی سنبھالنی عذاب ہوتی تھی۔ چنانچہ میں نے دھوتی پہننے سے انکار کر دیا البتہ باہر نہ نکلنے پہ رضامند ہوا۔

یادوں کی بارات میں گم راہ ہونے کے بجائے اتنا لکھنا ہی کافی ہے کہ جس جگہ دوستوں نے مجھے روپوشی میں رکھا تھا وہیں شاعرِ انقلاب حبیب جالب، ملک محمد اسلم اور ملتان کے ساتھی محمد علی بھارا بھی ضیاالحق کی سیاہ سپاہ سے چھپے ہوئے تھے۔ ہم پندرہ بیس دن چوبیس گھنٹے اکھٹے چھپے رہے۔ عشق اور انقلاب پہاڑ کے شاہین کو بَل کا چوہا بنا ڈالتے ہیں!!

جب کچھ عرصہ بعد میرے استاد اور ممتاز فزیشن پروفیسر ذوالفقار علی زیدی صاحب کی پہل کاری سے راجہ احمد خان نے مجھے نوکری دینے کا کہا تو میں نے خاموشی سے سائیں سے ملاقات کی جو کوئٹہ آئے ہوئے تھے۔ میرا موقف تھا کہ ''میں نوکری نہیں کروں گا، اصلی اور بڑا سیاسی ورکر بنوں گا، اور پیشہ ور انقلابی بنوں گا لہٰذا نوکری میں خود کو نہیں پھنساؤں گا''۔ بعد میں تو یہ ایک معمول بن گیا تھا کہ جب بھی میں اس طرح کی تکبر والی بات کرتا تو سائیں خاموشی سے سنتے تھے۔ میں بولتا جاتا، بولتا جاتا، جس وقت میرا جوش جذبہ اور تقریر اپنی بلندیوں اور چوٹیوں تک پہنچ جاتی تو سائیں یک دم کہتے؛ ''Take it easy''..... میرا موشن ٹوٹ جاتا۔ مگر اس زمانے میں ہمارے بیچ کچھ تکلفات

قائم تھے۔ دوستی نسبتاً نئی نئی تھی۔ Take it easy نہیں کہا بلکہ یوں گویا ہوئے

''نوکری لے لو، پاگل نہ بنو''۔

میں نے کہا؛ ''نہیں۔ بس حتمی بات ہے''۔

انہوں نے جب میرے موقف میں ذرا سی سختی پائی تو مجھے سمجھانے کے لئے خوبصورت راستہ یہ اختیار کیا کہ مجھ سے چار پانچ سوال پوچھے؛ ''اگر نوکری لے لو گے تو تمہاری تنخواہ کیا ہو گی؟'' میں نے اندازاً بتا دیا۔ پوچھا ''گاڑی ملے گی؟'' میں نے کہا ہاں ایمبولینس تو ملے گی ہی۔ ''دوائیں وغیرہ بھی؟''۔ ''ہاں سائیں''۔ ''بنگلہ بھی ملے گا، فون بھی، ایک آدھ چپڑاسی بھی اور چوکیدار بھی؟''۔ میں نے کہا ''ہاں''۔

کہنے لگے ''سادہ! یہ ساری چیزیں تم انقلاب کی خدمت میں استعمال کرو۔ خالی ہاتھ انقلابی تو پہلے بہت پھر رہے ہیں''۔ بات دل کو لگی۔

میں قائل ہو گیا۔ میں نے استاد محترم پروفیسر زیدی صاحب سے ہاں کہہ دیا۔ انہوں نے چیف سیکرٹری راجہ احمد خان سے ملاقات کا بندوبست کروا دیا۔ اور میں حکمرانی کے داؤ پیچ کے اس مہاماہر سے ملنے چلا گیا۔ وہ تازہ تازہ حج کر کے آئے تھے۔ اس لئے معذرت کی کہ میں واپس آیا تو پتہ چلا کہ تمہارے ساتھ بے انصافی ہو رہی ہے۔ میں نے تمہیں بلا بھیجا کہ اس زیادتی کی تلافی کروں۔ میں نے جوانی میں خود بھی مسلم لیگ کی سیاست کی۔ اس لئے سیاست گناہ نہیں ہے وغیرہ وغیرہ..... مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے 555 برانڈ کے سگریٹوں کا پیکٹ میری طرف بڑھایا، میں نے پینے سے انکار کر دیا اور وہ بول پڑے ''بھئی ہمیں پتہ ہے کہ تم سگریٹ پیتے ہو۔ تمہاری ایک ایک عادت، ایک ایک حرکت، ہمارے لوگ لکھتے رہتے ہیں۔ مجھ سے ٹریڈ یونین لیڈر بن کر مذاکرات نہ کرو بلکہ ری لیکس ہو جاؤ''۔ پھر وہ چیف سیکرٹری سے یک دم ہمدرد بزرگ بن گئے اور لگے نصیحتیں کرنے۔ اس زمانے میں سلیمان بلیدی نامی شخص نے ہر جگہ ڈاکے ڈال ڈال کر سرکار کو بہت خوفزدہ کر رکھا تھا۔

راجہ احمد خان بول پڑے ''دیکھو! سلیمان بلیدی کی طرح تم بھی بہت بدنام ہو چکے ہو۔ شہر میں جو بھی واردات ہو جائے پولیس والے تحقیقات کی اذیت سے بچنے کے لئے فوراً سلیمان بلیدی کے نام کا پرچہ کاٹتے ہیں۔ اسی طرح جب بھی کوئی پمفلٹ تقسیم ہوتا ہے یا جب بھی کہیں سیاسی وال چاکنگ ہوتی ہے، وہ تمہارے کھاتے میں لکھ دیا جاتا ہے''۔

راجہ احمد خان نے بل فائٹنگ کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ اس بھینس کی طرح ہماری خفیہ پولیس بھی سرخ رنگ کی دشمن ہے اور تم نے Red Tag (سرخ کپڑا) گلے میں پہن رکھا ہے وہ تمہیں کبھی نہ چھوڑیں گے۔ تم دو تین سال آرام سے کہیں نوکری کر لو۔ پولیس تمہیں بھول جائے گی''۔

بہر حال میں نے ہاں کر دی۔ راجہ احمد خان نے کہا ''بلوچ علاقہ نہیں دوں گا' پشتون علاقے میں جہاں چاہو، آرڈر کر دوں گا''۔ میں نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا کہ سرکار جس جگہ کو سب سے مشکل سمجھتی ہے وہ مجھے دیدے، میں جاؤں گا''۔

اور بے وقوف سرکار نے مجھے ژوب میں اپوائنٹ کر دیا۔ ان کے خیال میں یہی میری سزا بھی تھی اور سدھار بھی۔ پنجابی میں کہتے ہیں کہ؛ ''مخالف نے میری کمر پر لات ماری، اسے کیا پتہ تھا کہ میں کبڑا تھا، اس کی لات سے میرا کُب نکل گیا''۔ سرکار کو اندازہ نہ تھا کہ میرا مرشد، استاد، غمخوار، دوست اور راہبر وہیں ہے۔

بہر حال میں نے نوکری لی ژوب میں۔

میں شام کے وقت ژوب پہنچا۔ رات جیسے تیسے بسر کی۔ صبح سویرے سائیں سے ملنے آٹھ میل دور اُن کے گاؤں سلیازی چلا گیا۔ اور کیا خوبصورت راستہ ہے ان کے گاؤں کا۔ سڑک' بہتے دریا کے گرد طواف کرتی جاتی ہے۔ اور ڈھلوانوں میں آپ کو جگہ جگہ لمبے خندق نما نالے کھود کر قلمیں لگائے ہوئے انگوروں کے قطعات نظر آئیں گے اور زمین سے دو تین فٹ بلند لکڑیوں کے بے شمار ستونوں پر چڑھے ہوئے تاروں کے جال پر انگور کی بیلیں پھیلی نظر آئیں گی جنہیں رسیوں اور تاروں پر ایسا پھیلایا گیا ہے کہ نیچے زمین نظر نہیں آتی ..... جنت کے یہ ٹکڑے آپ کی راہنمائی کرتے ہوئے سائیں

تک لے جاتے ہیں۔ محبوب سے ملنے کا خوبصورت فردوسی راستہ!! اسی راستے نے اگلے چالیس برس تک میری دلجوئی، راہنمائی اور چارہ سازی کرنی تھی۔

اور سلیازی (اس مقام تک پہنچنے کے 100 راستے) نامی جگہ میرا مکتب و تربیت گاہ ٹھہری۔ مجھے کمال خان کی صورت ایک بڑے بھائی جیسا مونس و غمخوار دوست ملا، ایک ہمدرد پریوار۔ ہر ہفتہ وار چھٹی انہی انگوروں کے تاکستان میں علم و شعور کے موتی چننے کیلئے وقف۔

وہاں ژوب پہنچا تو سرکاری لوگ پہلے سے خبردار ہوشیار تھے۔ اور فہیم نامی آئی ایس آئی کا کیپٹن میرے پیچھے پڑ گیا۔ وہ مجھ سے زبردست دوستی گانٹھنے کی کوشش کرنے لگا؛ ''مری بہت اچھے لوگ ہوتے ہیں' بہت سیدھے سادھے ہیں۔ بہادر ہیں''۔ صبح و شام فون' سلام۔ ''تمہارا کیا حال ہے' کھانا اکٹھے کھالیں گے۔ یقین کرو یہ جاسوسی وغیرہ نہیں ہے۔ تم مجھے آزمالو، میں یاروں کا یار ہوں''۔

میں بار برداری سے ناآشنا اونٹ کی طرح' کبھی یہاں پھسل جاتا' کبھی وہاں جُل دیتا۔ اس نے از بس کوششیں کیں۔ اور میں ہاتھ نہ آیا۔ اس نے جا کر پولیٹیکل ایجنٹ سے دوستانہ انداز میں میری کم آمیزی کی شکایت کر دی۔ اکرم جان پولیٹیکل ایجنٹ تھے۔ میٹھے' بوڑھے اور شفقت بھرے۔ انہوں نے مجھے فون کیا؛ ''فہیم تمہاری شکایت کر رہا ہے' رات کو تم دونوں کا کھانا میرے ہاں ہے''۔ حیران ہوا' کیا کروں ..... یہ تو گویا میں بڑی سازش کے ساتھ سرکاری جال میں پھنسایا جا رہا ہوں۔ میں نے ایمبولینس نکالی اور دھواں دھار مرشد کے دربار۔ ''سائیں! اس طرح کا قصہ ہے' کیا کروں؟ سائیں میں پریشان ہوں' رحیم الدینی سرکار اُس شخص کے ذریعے میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اپنا سالن جیپ میں لاد کر آتا ہے' میرا کمرہ' دفتر اچھی طرح دیکھنا چاہتا ہے' مجھے باریکی کے ساتھ مشاہدے میں رکھا گیا ہے' میں کیسے جلا لوں اس بے بخت کو؟''

سائیں گھر سے گود میں پاؤ بھر سخت بادام لے آئے تھے۔ دو پتھر خود لئے، دو مجھے دے دیے۔ اور وہ بادام توڑ توڑ کر کھاتے رہے۔ مگر میں اُن کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اپنی پریشانی کا حل چاہتا تھا۔ جب مہمان کھانے سے انکار کر دے تو گویا اُس کو اہم مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ انہوں نے

میری پریشانی محسوس کی تو تب بلند آواز میں کہنے لگے؛ ''ھلکہ' کم از کم مجھے تو بتا دو کہ تمہارے پاس کونسا راز موجود ہے؟ کس انقلابی حکومت کی لگام تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم ذرا سا بولے نہیں اور وہ حکومت دھڑام سے گر جائے گی۔ تم نے کس جگہ پر بم بنانے کا کارخانہ لگا رکھا ہے کہ اس آئی ایس آئی والے کو خبر ہو جائے گی۔ تم نے کس کس حکومت سے امداد کے خفیہ معاہدے کر رکھے ہیں کہ وہ دستاویزات چھن جائیں گی؟۔ مہربانی کرو اور خود کو مفت میں بڑا آدمی نہ سمجھو۔ تم میری طرح کے عام انسان ہو۔ پتہ نہیں تم خود کو سمجھتے کیا ہو۔ عام انسانوں کی طرح اٹھو بیٹھو۔ بندے بن جاؤ تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے.....

''دوسری بات یہ ہے کہ تمہیں دعویٰ ہے کہ تم نے مارکسزم پڑھ رکھا ہے۔ تم ایک سیاسی ورکر ہو۔ تو پھر تمہیں اس شخص سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟۔ وہ تمہیں کیسے ورغلا پائے گا؟۔ خود پہ اعتماد رکھو۔ بلکہ اب تو میں تمہیں کہتا ہوں کہ جاؤ اُس شخص سے یاری بناؤ۔ اگر تمہارے ہاتھ سے وطن کی خدمت ہو سکتی ہے تو کر لو خواہ اس شخص کی مدد سے ہی کیوں نہ ہو''۔

''سائیں آخر کس حد تک؟''۔

کہا؛ "Upto Islamabad"

میں واقعی واپس زمین پر آ گیا۔ میری پھنے خانی پنکچر ہو گئی۔ میں بہت شانت ہو گیا۔ بات سمجھ میں آ گئی۔ تب میری اور فہیم کی یاری ہو گئی۔ نہ فہیم مجھے نگل گیا اور میں تو اسلام آباد تک پہنچنے کا اہل تھا ہی نہیں۔ البتہ میں رومانٹس ازم سے باہر نکلا' اپنے خوفزدہ دل میں شک اور وسوسوں سے نجات پا گیا۔ پتہ نہیں انقلاب کو کچھ فائدہ پہنچا' یا نہیں لیکن میری اپنی لاپرواہی لاابالی کم ہوتی گئی اور میں آوارہ جانور کے بجائے نیم دماغ انسان ضرور بن گیا۔

پتہ نہیں سائیں نے میری طرح کے کتنے جوانوں کو یوٹوپیا، رومانیت' اور suspicious ہونے سے بچا لیا.....تو کیا یہ شخص مرشد نہیں ہے؟!

میں دو سال تک ژوب میں رہا۔ اور اس پورے زمانے میں تقریباً بلاناغہ ہر ہفتہ وار تعطیل

کو سائیں کا مہمان ٹھہرتا۔ انہوں نے دو بہت ہی خوبصورت نشست گاہیں بنا رکھی تھیں۔ جمالیات کے نمونے تھے وہ۔ انہوں نے گھر کے پاس ہی انگوروں کی بیلیں اس خوبصورتی سے اگائی تھیں کہ ان سے ایک چوکور یا مربع بن گیا۔ کوئی دیوار نہیں۔ بس انگوروں کا کمرہ۔ وہی بیلیں اور ان کے سبز پتے ہی دیواریں اور وہی چھت۔ چھت کی بلندی اتنی کہ انسان آرام سے نیچے چل پھر سکے۔ اور انگوروں کا یہ کمرہ اتنا بڑا تھا کہ ہر طرف سے اس کی لمبائی چار ساڑھے چار گز تھی۔ اس کمرے میں انگوروں کی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک ڈیڑھ فٹ کے پتھروں کے چپٹے حصے جوڑ جوڑ کر بالکل صوفہ سیٹ کی طرح مسلسل نشستیں بنا دیں۔ پشت پہ بھی' خود نشست گاہ پہ بھی اور بیٹھے ہوئے ٹانگوں کی اونچائی میں بھی یعنی زمین سے دو فٹ اونچائی تک خوبصورت' ڈیزائن میں پتھر کی قدرتی سلیں رکھیں' پھر ایسے ہی خوبصورت پتھروں کی (نشست گاہ) دو فٹ بلند دیوار تا کہ صوفے کی طرح سے پشت کو ٹیک دی جا سکے۔ ان بڑے پتھروں کے چپٹے حصوں کے درمیان کی درزیں مزید چھوٹے چپٹے پتھروں سے بھر دی گئی تھیں۔ یہ پتھر وہ قریبی دریا اور پہاڑ سے چن چن کر لائے تھے اس لئے یہ بہت ہی رنگدار قسم کے' بہت خوبصورت لگتے تھے۔ ہو بہو صوفہ سیٹ' مگر پتھر جیسا سخت صوفہ۔ اور جو فرش تھا وہ دریا کی نرم نیلی ریت بچھا کر بنا دیا گیا تھا اور جب انگور پکتے تھے تو آپ کو اسی کمرے میں چھت پر سے زندہ سلامت لٹکتے درجنوں گچھے نظر آتے۔ چاہیں تو پاؤں پہ اٹھ کھڑے ہوں اور انگور کھانے لگیں' چاہیں تو گچھا اتار کر پتھر کے صوفے پہ بیٹھ کر آہستہ آہستہ شاہانہ طرز پہ انگور خوری کریں۔ (انگور نوشی البتہ ناممکن' کہ یہ سپیشلٹی سائیں کی نہیں' خدائیداد کی ہوتی تھی۔ اور خدائیداد تو دُور کوئٹہ میں رہتا تھا)۔

اسی بیٹھک میں عام راہ گزر مسافر آتے، کھانا کھاتے یا چائے پیتے (ان علاقوں میں ہوٹل اور ریسٹورنٹ نہیں ہوتے ہیں' آپ جس گھر گئے بطور مہمان وہاں سے خاص تواضع سے کھانا کھایا اور چل دیے)۔ ارادہ کر کے آنے والے مہمان بھی بے شمار ہوتے۔ قبائلی فیصلے کیلئے لوگ آ جاتے۔ یہیں پہ ادب کے شائقین آتے، سیاست کے دھنی آ جاتے۔ میری چھوٹی موٹی تربیت کا ایک بڑا حصہ یہیں پہ ہوا۔ میرے علاوہ بھی بیسیوں انسانوں نے اپنی شخصیتوں کی تکمیل کی چہل قدمی یہیں سے شروع

کی۔(مگر پھر بھی سائیں کو استاد کہلانے سے چڑ کی حد تک نفرت تھی۔لفظ ''استاذ'' تو گویا اس پر کفر کا فتویٰ ہوتا)۔

سائیں کی اِس مزین بیٹھک کی ایک اہم بات یہ تھی کہ وہ اکثر بھری رہتی تھی۔ بالخصوص ہفتہ وار تعطیل کے دن تو اچھا خاصا رش ہوتا۔سائیں کے ہم خیال بھی ہوتے، اور مختلف نقطہ نظر رکھنے والے بھی۔ایسے لوگ بھی اُن کے پاس آتے جنہیں صرف یہ تجسس ہوتا تھا کہ ایک گولڈ میڈلسٹ عالم یہاں ویرانے میں کیا کر رہا ہے۔اور ثمر دار گھنی چھاؤں والا یہ درخت اپنا پھل اور سایہ عطا کرنے میں کبھی بخل سے کام نہ لیتا۔کوئی کتاب مانگ رہا ہے، کوئی سوال پوچھ رہا ہے، کوئی اپنے ذاتی مسئلے پر مشورہ مانگ رہا ہے، کوئی سفارشی خط کے لئے موجود ہے۔

سائیں کا ژوب ایک طرف اگر روشن خیال لوگوں کا مسکن ہے تو یہی ضلع' پاکستان بھر میں سب سے قدامت پرست ضلع بھی ہے۔ یہ ضلع جمعیت علمائے اسلام (جو کہ بلوچستان کی جماعتِ اسلامی ہے) کا گڑھ ہے۔اُس زمانے میں افغان انقلاب اپنی بھرپور جوانی پر تھا۔اور یہاں ضیاالحق اور اس کی نظریاتی و جنگی فوجیں امریکی، مغربی اور سعودی امداد سے بہت موٹی ہو چکی تھیں۔

حکومتِ پاکستان' جمعیت علمائے اسلام و جمعیت علمائے پاکستان' جماعتِ اسلامی' پیپلز پارٹی، ساری مسلم لیگیں اور ساری پارٹیوں کے ہزاروں لاکھوں ورکر افغان انقلاب کے خلاف سرد جنگ سے ہوتے ہوئے اب غیر اعلان شدہ گرم جنگ شروع کر چکے تھے۔گویا سارا پاکستان افغان انقلاب کا دشمن تھا اور محض مٹھی بھر لوگ افغان انقلابی حکومت کے حق میں تھے۔میں سرگرم طور پر افغان انقلاب کا دفاع کرنے والوں کے ساتھ تھا۔اس لئے ملاّ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے۔''یہ کافر ہے' روس کا ایجنٹ ہے' نواب خیر بخش مری کا آدمی ہے' پشتونخواہ پارٹی کا خیر خواہ ہے.....''۔ لاٹھیاں، پتھراؤ' جلسہ جلوس' مسجد منبر جہاں جہاں انہیں موقع ملتا میری مخالفت کرتے۔حتیٰ کہ انہوں نے جوگیزئی نواب (جو ساری پشتون قوم کا نواب ہے) کو میرے خلاف لا کر منبر پر کھڑا کر دیا جسے خدا خبر خود بھی قبلہ کا پتہ تھا یا نہیں۔

مست توکلی میری مدد کو آئے۔ مجھ میں دنیا بھر کی بہادری سمٹ آئی۔ میں ناقابلِ بیاں جرات کا پیکر بنا۔ پتہ نہیں کس غیب سے بیک وقت کمیونسٹ کردار، بلوچی غیرت اور انسانی وقار کی ٹھاٹھیں مارتی موجیں موجزن ہو گئیں مجھ ناچیز میں۔حالانکہ یہاں نہ تو ''میرے باپ کے بیٹے مری'' تھے' نہ میرے پاس فوج اور ارد تھی' نہ میری سیاسی پارٹی یہاں تھی' نہ صلاح و مشورے کے لئے رندوں کا کوئی دیوان تھا۔سارا نیلا وسیع ژوب سرکار کے ساتھ ایک طرف' اور میں اپنے خوبصورت خدا کے ساتھ دوسری طرف۔ملاّ تھے بپھرے چہروں کے ساتھ.....میں صرف اور صرف' جی ہاں صرف اور صرف مست کے اس اشارے پر چلا؛

''وہیں جاؤں گا جہاں شیرانی جمع ہیں''

مگر یہاں تو شیرانی بھی مولوی محمد خان شیرانی کے ساتھ تھے۔میرے پاس صرف ایک شیرانی کا دروازہ تھا؛ کمال خان شیرانی کا دروازہ۔وہ کسی فوج، توپخانے اور فرمان کے ذریعے میری کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔اور نہ اس لڑائی میں کھل کر میرا ساتھ دے سکتے تھے۔بس رہنمائی کے لئے انہی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔صرف حوصلہ افزائی کر سکتے تھے۔میں نہ افغان انقلاب کو بچا سکا' نہ سیاست کو تبدیل کر سکا۔محض ایک تمغہ لے سکا' ایسا تمغہ جو مجھے زندگی بھر اپنے سینے پہ لگائے فخر کی حدت بخشتا رہے گا۔سائیں نے فخر سے مجھے گلے لگایا اور کہا؛

''تہ مرائی نہ یئے زمرائے یئے (تم مری نہیں شیر ہو) تم نے میرا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا' رجعت کے سامنے گڑگڑائے نہیں' تن تنہا ان کی یلغار کو کامیابی سے روکے رہے''۔

ملاّ اور ہمارا یہ جدل عرصہ تک جاری رہا۔ملاّ کے پاس ایک بہت بڑی ہستی کا منبر تھا جسے اس نے ناجائز ہتھیا لیا تھا' چاروں طرف رخ کئے ہوئے لاؤڈ سپیکروں کا سیٹ تھا جس میں وہ میرے خلاف تقریر کرنے سے پہلے دو تین پھیپھڑے شکن پھونکیں مارتا تھا' اُس کے پاس جلسہ گاہ تھی' جلوس کے لئے لوگ تھے' اخباری بیانات تھے' تار ٹیلی گرام تھے۔میرے پاس سوائے استقامت کے اور کوئی ہتھیار نہ تھا۔سائیں سے ملاقاتیں جاری رہیں، ملاّ اپنی مستیاں کرتا رہا۔سرکار نے مجھے ٹرانسفر کرنے

سے انکار کر دیا' پولیس کا پہرہ لینے سے میں نے انکار کر دیا' مسجد میں جا کر دوبارہ ایمان قبول کرنے والی بچگانہ بات میں نے بڑی حقارت سے ٹھکرا دی۔

اس ڈیڈ لاک کا کوئی حل نہ تھا۔ اور' بہر حال ملاّ کو ہی پسپا ہونا تھا۔ اور ایسا ہی ہوا، بقول توکلی مست ''شاہ (امام حسینؓ) نے مجھے سیلاب سے سلامت باہر نکالا''۔ میں فتح مند' باوقار ملازمت کے دو سال پورے کرنے کے بعد عام روٹین والے ٹرانسفر کے نتیجے میں ژوب سے چلا آیا۔ میں آج بہت ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ اگر سائیں کے مشورے اور ٹھنڈا بزرگانہ سایہ مجھ پر نہ ہوتا تو فریقین میں سے کسی کا نقصان ضرور ہوتا۔ اور چونکہ میں ہر لحاظ سے کمزور مورچے پر تھا اس لئے احتمال میرے ہی نقصان کا زیادہ تھا۔ ابھی چند سال پہلے سائیں جب کوئٹہ آئے تھے تو ماما عبداللہ جان نے اُن سے برملا کہہ دیا تھا؛ ''ہم سب دوست آپ کے ممنون ہیں کہ آپ نے ہمارے اس محبوب کو ملاؤں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچا لیا''۔

سائیں نے درجنوں بیسیوں نوجوانوں کو بے پردہ زندگانی گزارنے سے بچا لیا۔ ان کی سیاست سے اتفاق ہو نہ ہو' مگر سی آر اسلم کی طرح سائیں کے بھی احسان مند لوگ بہت زیادہ ہیں۔ کمال خان نامی یہ سنگِ میل تو کیا' کوئی بھی بڑے سے بڑا ہادی اور راہبر بھی منزل کے فاصلے کو کم نہیں کر سکتا، مگر یہ ضرور ہے کہ کمال خان زندگی بھر راہِ عشق پہ دلوں کے لئے بچھائے گئے کانٹوں کو اپنے دل میں پیوست کرتا رہا تا کہ آنے والوں کے لئے کانٹے کم ہوں۔ کمال خان جیسے راہبروں نے راستہ ذرا سا روشن کر دیا اور سفر ذرا سا آسان اور محفوظ بنا لیا۔

ژوب میں گزارے گئے ہلچل بھرے دو سالوں کے دوران کچھ عرصہ میں نے سائیں کی سیاسی پارٹی کو ممبر کے طور پر اپنایا، اس لئے کہ میری اپنی پارٹی وہاں تھی نہیں۔ کمیونسٹ لوگ ڈسپلن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ ایک آدھ سٹڈی سرکل بھی چلایا' ممبر شپ والا چندہ بھی دیتا رہا۔ ہر ہفتہ وار تعطیل پہ سائیں کے درِ خانہ کی حاضری بھی دیتا رہا' بلا ناغہ۔ ان کا گھر ویسے بھی سلیازہ کہلاتا ہے جس کا مطلب وزیر مسعود قبائل ''سل یوزائے'' یعنی ''سو ایک جگہ'' گردانتے ہیں۔ یعنی سو راستے اسی نکتے پر

آن ملتے ہیں۔ پھر کیا کیا سیاسی، نسلی آندھیاں چلیں، کیا کیا دباؤ آئے، کیا کیا مصلحتیں پیدا ہوئیں مگر ہم دونوں گہری قربت میں ہی رہے۔

عملی زندگی میں ضروری نہیں ہوتا کہ صرف آپ کی غلطیوں اور زیادتیوں کی وجہ سے آپ کے دشمن پیدا ہوں۔ بہت بار ایسا ہوتا ہے کہ آپ کی اچھائیاں آپ کے دشمن پیدا کرتی ہیں۔ آپ کی خیر خواہی آپ کے لئے بدخواہی پیدا کر جاتی ہے۔ مجھے اپنے بے شمار دوستوں کی دوستی پر فخر ہے۔ دوستیاں میرا حاصل ہیں۔ مگر میری سب سے بڑا حاصل یہ رہا کہ میں نے کمال خان جیسے چند ایسے دوست بنا لئے جو اُس وقت بھی میرے دوست رہے جب بے شمار لوگ میرے خلاف تھے۔ کمال خان مجھ سے محبت کرتے تھے، وہ میرے رشتہ دار نہ تھے مگر میرا خیال اُنہی جیسا رکھتے تھے۔ وہ میرے عزیز نہ تھے مگر میرا غم خوشی قریبی عزیزوں جیسا بانٹ لیتے تھے۔ وہ بڑے بھائی کی طرح ڈانٹتے تھے، چھوٹے بھائی کی طرح تنگ کرتے تھے۔ وہ میرے نظر انداز کئے جا سکنے والے دوست نہ تھے اس لئے کہ مجھے کبھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔

وقت بدلتے رہے، حالات بدلتے رہے، لوگوں کے ساتھ واسطے تعلق بنتے بگڑتے رہے مگر سچ یہ ہے کہ چند اور ہستیوں کی طرح کمال خان کے بارے میں ہمیشہ میرا ایمان رہا کہ؛

باغِ بہشت و سایہِ طوبیٰ و قصرِ حور
با خاکِ کوئے دوست برابر نمی کنم

میری اُن کے ساتھ دوستی کے بارے میں ہم دونوں پر یہ شعر صادق آتا تھا؛

خلق دی ویائی چی سه ویائی
ما پرے آخستے دئی ده کلیو تهمتو نه

ترجمہ؛

لوگوں کو کہنے دو جو کہتے رہیں
میں نے (تمہاری خاطر) گاؤں کی تہمتیں سہیں

کمال خان کُش کمال خان

شیکسپیئر نے کہا تھا کہ ''اگر تم سورج کی طرح بننا چاہتے ہو، تو سب سے پہلے سورج کی طرح جلنا سیکھو''۔ میں نے کمال خان کی زبان سے شیکسپیئر کا یہ زریں فقرہ تو کبھی نہیں سنا مگر کمال خان نے اپنے نفس کو ہو بہو شیکسپیئر کے فرمان کے مطابق جلا ڈالا تھا۔

کمال خان کی سب سے بڑی صفت یہ تھی کہ اس نے دوسرے بڑے انسانوں کی طرح اپنی ضروریات بہت کم کر دیں۔ کپڑوں جوتوں کے ایک دو جوڑے، اور بس۔ نہ حسینوں کے خطوط اور نہ تصویرِ بتاں۔ اس نے نہ صرف لباس میں، وضع قطع میں بلکہ اپنی پوری شخصیت میں ایسی پکی تبدیلیاں کی تھیں کہ اپنی زندگی کے آخری سفر تک وہ عام آدمیوں میں سے رہا اور انہی میں سے اٹھایا گیا۔ اس نے ایک عام اور سادہ دیہاتی بوڑھے کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ جو لوگ ان سے پہلے واقف نہ ہوتے تو وہ انہیں دیکھ کر یہ تصور تک نہ کر سکتے تھے کہ وہ ایک سکالر، ایک مفکر اور فلاسفر کے منور حلقے میں آ چکے ہیں۔ وہ تو ایک آدھ فقرہ کہنے سننے پہ عقیدت سے سر جھکنے پہ اندازہ ہوتا تھا کہ کمال خان پہچانا جا چکا ہے۔ یہ شخص زندگی بھر ہمہ وقت اپنی شخصیت کی تکمیل میں لگا رہا۔ (اور شخصیت کی تکمیل ذات کی نفی

کے بغیر بھلا کہاں ہو سکتی ہے؟)۔ چنانچہ ہمارا یہ کمال خان ہمہ وقت اُس کمال خان کو مار ڈالنے کا کام کرتا رہا جس کا کبھی بھی سر اٹھانے کا خطرہ موجود ہو سکتا تھا۔ تصور کیجئے کہ اگر کمال خان ''کمال خان کشی'' کا کام نہ کرتا رہتا اور کمال خانی کو بلا روک ٹوک سر اٹھانے دے دیتا تو کتنی بدترین شخصیت پرستی شروع ہو جاتی اور اصل کمال خان کی تو کب کی موت واقع ہو چکی ہوتی۔ کتنا بڑا آدمی تھا کہ اس نے میرے تیرے لئے اصل کمال خان کو بچائے رکھا۔ میرا تیرا سچل، میرا تیرا کمال خان بقول سچل سرمست؛

جو نہ ہستی کو مٹا کر جائے گا
وہ وہاں دوزخ کے اندر جائے گا

میں سائیں کمال خان شیرانی کا وہ ضبط دیکھتا تو حیران رہ جاتا کہ اس نے خود کو ملنے والی شہرت اور عزت کو ہضم کس طرح کیے رکھا۔ سائیں مردہ پرستی کا بت نہ بنے۔ بلکہ ہم بہت سارے خوش نصیبوں نے انہیں زندگی ہی میں بڑا جانا، ان کی پذیرائی کی، انہیں نازا اور پیشوا مانا (دل ہی دل میں) اور سائیں کو اس بات کا پتہ تھا کہ وہ ایک سیاسی و فکری ادارہ بن چکے ہیں، ایک مکتبِ فکر بن چکے ہیں اور بڑی تعداد میں پیروکار رکھتے ہیں۔ مگر جس شانِ بے نیازی سے وہ اپنی اس پوزیشن سے نمٹے وہ بذاتِ خود ولایت سے کم درجے کی نہیں ہے۔ مسیحیوں میں سے ہوتے تو بلاشبہ سینٹ کمال خان کہلاتے مگر مجھے یقین ہے کہ اس کی اجازت بھی وہ اپنی موت کے بعد ہی دیتے، جب وہ اجازت نہ دینے کی سکت سے ہی محروم ہو چکے ہوتے۔

کمال خان کو اپنی بڑائی کا گھمنڈ بالکل بھی نہ تھا۔ محفل میں ذرا بھی احساس ہوتا کہ کوئی شخص اُن کے سامنے بہت زیادہ ''باادب باملاحظہ''، والے ادب آداب کا شکار ہے تو وہ فوراً اس پہ متوجہ ہوتے اور باتوں باتوں میں اس کی سطح بلند کر کے اپنے برابر بنا لیتے اور بقیہ وقت بہت comfortable انداز میں گپ شپ ہوتی۔ آپ اس کے سامنے اُس کی اپنی کوئی کوٹیشن یا تعریفی قصہ دہراتے تو شانت کمال خان، بقول ہمارے دوست بنی بزدار کے؛ ''وہ دانشور نہ تو چونکتے اور نہ

آپے سے باہر ہوتے ..... گویا کسی نے سمندر کو سمندر کہہ دیا ہو''۔

سائیں کمال خان اپنی وضع قطع میں، اپنی گفتار اور چال ڈھال میں مجسم عجز تھے، مجسم انکسار تھے۔ تکبر اور غرور سے میلوں دور۔ خودنمائی اور خودستائش تو انہیں چھو کر بھی نہ گزری تھی۔ نہ علم کا غرور نہ عمر کا، نہ تجربے کا اور نہ سماج میں خاص عزت واحترام کا۔ وہ جانتے تھے کہ؛

بہ جز جانگدازی بجز جاں نثاری
میسر نہیں اتصالِ محباں

آپ تصور کر سکتے ہیں کہ موت سے چند برس قبل ہمارا یہ فلاسفر کس قدر جانا پہچانا جاتا تھا بلوچستان میں۔ ہم ایک بار محفل میں بیٹھے تھے کہ مکران کا ہمارا ایک بہت اچھا دوست بھی وہاں آ گیا۔ وہ ساٹھ برس کا تعلیم یافتہ ریٹائرڈ ایجوکیشنسٹ ہے۔ میں نے خاموشی سے دیگر لوگوں کے ساتھ ساتھ سائیں کا تعارف بھی کرایا۔ اس نے کمال خان کا نام سن رکھا تھا اور فطری طور پر چاہتا تھا کہ سائیں سے براہِ راست تعلقات بنائے۔ یہ بتا دوں کہ جب محفل میں میں اس دوست کو کوئی جملہ بولنے سے قبل اپنا پورا جسم ہلاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ معصومیت کی حد تک کوئی احمقانہ بات ضرور کرنے والا ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ اس کی توجہ ہٹا دوں مگر وہ چڑ جاتا ہے اور ضرور وہ بات کہہ ڈالتا ہے جو انجانی محفل میں ہزیمت کا باعث بنتی ہے۔ چنانچہ میں نے جب اس دن بھی سائیں کی طرف دیکھتے ہوئے اُسے ہلتے ہوئے دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ آج انہونی ہونی ہی ہے۔ میں نے بلا کو ٹالنے کیلئے اس کو کہا کہ آپ کے ذہن میں کیا بات ہے، پوچھو میں بتا دوں گا۔ مگر وہ چڑ گیا اور میری طرف دھتکارنے کے انداز میں گھور کر فوراً سائیں سے بھری محفل میں پوچھ ہی لیا؛ ''آپ کی وجہِ شہرت کیا ہے؟''۔ پوری محفل خاموش، جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ سب سکتے میں کہ بلوچستان میں رہنے والا اس قدر معمر اور پڑھا لکھا شخص سائیں سے یہ پوچھ رہا ہے۔ مگر سائیں تو محفلوں کی جان ہوا کرتے تھے۔ وہ بھلا کیوں حاضرین کو تفکر آمیز مسکان میں مبتلا نہ کرتے۔ برجستہ انداز میں جھٹ سے بولے؛ ''میری وجہِ شہرت میری stupidity ہے.....''۔ اس لفظ کو انہوں نے زندگی بھر گویا صرف اور صرف اپنے

لئے وقف کر رکھا تھا۔

ہر صاف دل انسان کی طرح ہمارے دوست حاجی شمیم آفریدی بھی سائیں کے معتقدوں میں شامل تھے۔ مگر شروع شروع میں اُن کی طبیعت سے واقف نہ تھے۔ لہٰذا انہیں کھانا کھلانے یعنی ان کی دعوت کرنے پر اصرار کرتے رہے۔ سائیں حسبِ عادت معافی مانگتے رہے، معذرت کرتے رہے۔ جب یہ تکرار اور اُن کا انکار بڑھتا رہا تو سائیں نے آخر وہ سنہرا فقرہ کہہ ہی ڈالا جو صرف اُسی کا خاصہ تھا؛

''میرا بار بار کا انکار میری احمقی کا ثبوت بنتا جا رہا ہے''۔

سائیں اپنی فکر اور نظریہ پر، اپنی کمٹمنٹ پر کوئی نعرے بازی بالکل نہیں کرتے تھے۔ آپ نے اگر انہیں غصہ دلانا ہوتا، اُن سے قطع تعلق کرنا ہوتا تو اس کے لئے آپ کو قبائلی معاشرے کی مغلظات بکنی ہوتیں۔ لیکن اگر کوئی اس حد تک نہ جانا چاہتا اور نام نہاد تہذیبی دائرے میں رہ کر اُن سے فاصلہ پیدا کرنا مقصود ہوتا تو آپ انہیں ''لیڈر'' کہہ دیتے، ''عظیم انسان'' کہہ دیتے یا ''استاد'' کہہ دیتے ..... پھر یہی فقرہ ایک دو بار دوہرا بھی دیتے تو یقین کر لیتے کہ دوا کارگر ثابت ہوئی۔ وہ آپ سے یوں پھسل کر نکل جاتے کہ دوسری بار آسانی سے ہاتھ نہ آتے۔

انہیں نام ونمود سے الرجی تھی۔ جب دیکھتے کہ دوسرا شخص اس کی کسر نفسی کو سمجھ نہیں رہا ہے تو فوراً کہہ دیتے؛ ''مغرور نہیں ہوں معذور ہوں''۔ سائیں کمال خان اپنے بارے میں بے پرواہ آدمی تھے، اپنے وطن کی طرح، اپنے وطن کی سربلند چٹانوں کی طرح بے پرواہ۔ سلیمان کی وسعت یافتہ کوہ کی طرح کسی کو یہ خبر بھی نہیں ہونے دیتے تھے کہ ان کے سینے میں ہے کیا۔ بہت ٹھہرے ہوئے آدمی تھے۔ گرانقدر شخص۔

وہ بہت سلیکٹو تھے۔ صحبت میں، دوستیوں میں، مطالعے میں ..... وہ ہر بھورے پتھر پر کھڑے ہو کر تقریر نہیں کرتے تھے۔ سائیں اپنی زندگی میں اس قدر سادہ انسان تھے جتنا کہ ژوب میں کمال خان شیرانی اپنی زندگی میں سادہ تھا۔ ایسے بچے تو خدا کرے مائیں بار بار جنیں۔ بے تکبر، بے ساختہ، انفارمل۔ کمال خان فارمل ازم کو منافقت سمجھتے تھے۔ وہ Originality کے دلدادہ تھے۔

اسی نفس کشی کے بدولت ہی تو وہ بہت آسانی سے رسائی میں آسکنے والے شخص تھے۔

اس سینئر ترین شخص نے کبھی اپنی پارٹی میں عہدہ قبول نہ کیا۔ وہ کرسی، عہدہ، خطاب، اور حیثیت سے دور بھاگتے تھے۔ وہ اخباری بیانات، ریڈیو ٹی وی انٹرویوز اور تقریروں سے ہمہ وقت اجتناب کرتے رہے۔ ایک دفعہ انہیں محمود خان اچکزئی نے ایک سیمینار کا صدر بنایا۔ ان کی پوری صدارتی تقریر محض ان الفاظ پر مشتمل تھی؛ ''دوستو، آپ بہت دیر سے بیٹھے احباب کی تقریریں سُن کر تھک چکے ہیں۔ دَ خدائی پہ امان''۔

وہ ممتاز ہونے سے نفرت کرتے تھے۔ انہوں نے نہ تو سیاسی پارٹی میں کوئی عہدہ لیا اور نہ یقینی سینیٹری قبول کی۔ سینیٹری کی پیشکش ہوئی تو آسانی سے کہہ ڈالا ''ورکے کہ۔ (گم کرو) ''زہ ٹرنہ جوڑیژم'' (میں ''ٹر'' نہیں بنتا)۔

مگر جب بعد میں ہم نے انہیں چھیڑا کہ سائیں سینیٹری تو بہت اچھی چیز تھی' آپ نے قبول نہ کر کے غلطی کی۔ اس لئے کہ سینٹ میں ایک بہت بڑی لائبریری ہے' تو وہ کہہ دیتے؛ ''ارے مجھے تو اس کا پتہ ہی نہ تھا''۔ رضا کارانہ طور پر سیاسی عہدوں اور اقتدار سے ایسی بے نیازی اور دوری پورے خطے کی بورژوا سیاست کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

مطالعہ کے لئے ظاہر ہے آنکھیں چاہئیں اور 88,87 سال کی عمر میں کثیر المطالعہ انسان کی آنکھیں کمزور ہوتی ہی ہیں۔ مگر کمال خان تو پشتو میں خوبصورتی سے فخریہ انداز میں کہتے ہیں؛ ''میں نے اپنی آنکھوں میں نگینہ ڈلوادیا ہے''۔ وہ دراصل Intra occular lense کی بات کر رہے ہوتے۔ اور وہ بھی انہوں نے کسی فائیو سٹار ہاسپٹل سے نہیں لگوائی تھی بلکہ ایک عام فری آئی کیمپ لگا تھا، ژوب میں' اور وہاں اس عظیم المرتبت انسان نے اپنے سب سے پیارے اور سب سے نازک عضو یعنی آنکھ کا آپریشن کروادیا۔ Declass، بہادر، ''اشراف'' اور عظیم کمال خان!!!۔

''ہرنیا'' کا آپریشن تو انہوں نے ہمارے سامنے عام سول ہسپتال کوئٹہ کے عام جنرل وارڈ میں کرایا تھا جہاں کے باتھ روم کی بدبو سمرقند و بخارا تک جاتی تھی۔

کیا انسان تھا، کم از کم خواہشات والا۔ نہ شاپنگ کا شوق تھا نہ خریداری کے شعبوں کی تعداد بڑھائی۔ انہی بے پرواہ عادتوں کی بدولت تو نہ اس نے سرمایہ کو مانا اور نہ اس کے خداؤں کو تسلیم کیا۔

کمال خان شیرانی اپنے گھر کا کام خود کیا کرتے تھے۔ زمینداری، دیواریں بنانا، اور جلانے کی لکڑی جمع کرنا۔ اُن کے کسی شرارتی مرید نے اُن کی دو معصوم تصویریں اپنے موبائل سے اُس وقت کھینچیں جب وہ پیٹھ پر جنگل سے جلانے کی لکڑیاں جمع کر کے پیٹھ پر لادے گھر آرہے تھے۔

شیریں سخن کمال خان

لفظ یعنی نطق صرف انسان کا خاصہ ہے۔ ہم حیوانات میں ناطق ہونے کے سبب ہی تو اشرف المخلوقات ہیں۔ گویائی، گفتگو اور بات چیت ایک اشراف انسانی عمل ہے۔ اور یہ خصوصیت (ماسوائے چند معذور انسانوں کے) ہم سب میں موجود ہے۔ مگر گفتار کی مٹھاس، شیرینی اور لطف اندوزی ہر انسان کو میسر نہیں ہے۔ یہ تو کچھ کچھ لوگوں کو ودیعت ہوتی ہے۔.....اور کمال خان انہی چند خوش قسمت لوگوں میں سے تھے۔ اُن کے پاس ایک حیرت انگیز لطیف اور فی البدیہہ مزاح (Wit) موجود تھا۔

یہ بات درست ہے کہ سائیں نے بہت کم لکھا، بہت کم جلسہ جلوس کی صدارتیں کیں۔ اور بہت کم سمیناروں کی خصوصی مہمانی کی۔ اس کے باوجود وہ بہت ہر دلعزیز انسان تھا، صرف اور صرف اپنی خوش گفتاری کے سبب۔ اور گفتگو تو آئینہ ہوتی ہے، جس میں بولنے والے کی شخصیت کی مکمل تصویر کشی ہوتی ہے۔

سائیں کمال خان شیرانی اپنے مختصر اور برمحل مزاح بھرے جملوں سے محفل کو لالہ زار بناتا تھا۔ خوبصورت ادبی فقرے، فلسفیانہ باتیں، تصوف، سماجی انصاف کی باتیں، خوشگوار لطیف مزاح کی

باتیں، چاشنی بھری باتیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس کے ایک شاگرد (اور میرے ایک استاد) عبدالرحیم مندوخیل ہر بات میں اس کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ اُن کا تو گویا تکیہ کلام ہوا کرتا تھا؛ ''وہ ہمارے سائیں کمال خان کہتے ہیں.....'' رحیم صاحب ہر موضوع میں بولتے ہوئے کتنی بار سائیں کے کوٹیشن سنایا کرتے تھے۔ ظاہر ہے میں بہت متاثر ہوا تھا اور سائیں سے ملنے کا اشتیاق بہت بڑھ گیا۔ تجسس سے بھرا ہوا، جب میں پہلی بار سائیں سے بہ نفس نفیس ملا تو اسے واقعی ایسا پایا۔ آپ منہمک ہوجاتے سائیں کی گفتگو میں۔ آپ مسکرائے بغیر رہ نہ پاتے۔ بہت خوبصورت' سادہ زبان اور اس میں ایسا مہذب و متوازن مزاح کہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوا جائے۔ ایک ایسے ہی موقع پر قہقہے لگا لگا کر جب اس کا گہرا دوست تھک گیا تو بلوچی میں کہہ بیٹھا'' سائیں ترا قرآن جنا'' (سائیں تمہیں قرآن مارے)۔ تو اس نے بلا توقف فی البدیہہ میٹھی بلوچی میں اسے جواب دیا؛ ''مناں alreadyجتئی، مناں alreadyجتئی''۔

اور اُس کا یہ مہذب و رنگین انداز بہت فی البدیہہ ہوا کرتا تھا۔ مثلاً میں ایک پیتھالوجسٹ ہوں اور لیبارٹری ٹیسٹ کرتا ہوں۔ جب میں کسی بات پر اُڑ جانے کی علامت کے بطور بلوچی قسم کھاتا؛ '' حرام ہے اگر ایسا کرنے دوں'' تو فوراً کہہ دیتا؛ ''تمہاری قسم کی کوئی وقعت نہیں' سارا دن Acid اور Alkali سے تمہارا واسطہ رہتا ہے' جو نہ حلال ہیں نہ حرام''۔

میری والدہ فوت ہوگئیں تو کمال خان نے فون پر تعزیت کی۔ وہ ایک فقرہ میں وہ پریکٹیکل بات کہہ گیا جس نے اس کے باوجود بہت غصہ دلایا کہ وہ حقیقت بات تھی؛ ''مائیں تو ہوتی ہی مرنے کیلئے ہیں''۔

ہمارے ایک مشترک دوست نے بحث کرنے کے بعد لاجواب ہو کر سائیں سے گلہ کے انداز میں کہا؛ ''آپ کو میرے نظریے پر شک ہے؟''۔ جواب برجستہ تھا؛ ''آپ کے نظریے پر مجھے شک نہیں، آپ کی عقل پر ہے''۔ ہاں، ایسا ہی تھا ہمارا دوست۔ ایک بار بحث مباحثے میں کسی نے تنگ آ کر اس سے کہہ دیا کہ آپ عجب آدمی ہیں تو سائیں نے جواب دیا؛ ''عجب نہیں' میر عجب ہوں''۔

اگر کبھی ماہ وسال یا اعداد وشمار میں کوئی شخص اُس کی کوئی غلطی نکالتا تو وہ بلا وجہ اڑ نہیں جاتا تھا۔ بلکہ یک دم ہتھیار ڈال دیتا اور فوراً کہتا؛ ''بھئی جس آدمی کی عمر ساٹھ سال کی ہو جائے تو اردو والے اسے کہتے ہیں 'سٹھیا گیا ہے' ہم تو ابھی 'اٹھیا گئے ہیں'''۔ اور پھر وہ آفریدیوں کی ضرب المثل سناتا؛ ''چہ دہ شپیتوشی، دَہ وشتوشی'' (جب آدمی ساٹھ سال کا ہو جاتا ہے تو اُسے مار دینا چاہیے)۔

کمال خان اپنی گفتگو میں حسبِ ضرورت اور برمحل طور پر حکایتیں، قصے، ضرب الامثال اور یادگار باتیں شامل کرتا تھا۔ سائیں قبائلی زندگانی پر بات کرتے کرتے اپنی نائب تحصیلداری کے زمانے میں قتل کے مجرم ایک مری سے بات چیت کا حوالہ دیا کرتا تھا۔ جب سائیں نے اس سے قتل کی وجہ پوچھی تو اس نے سادہ سا جواب دیا تھا؛ ''من نہ کشتہ۔ ما مڑ ثغوں، مڑ ثغوں، مڑتہ'' (میں نے تو نہیں مارا۔ ہم لڑتے رہے' لڑتے رہے' وہ مر گیا)۔

وہ اپنی گفتگو میں دوسری زبانوں کی ضرب الامثال بھی خوب ڈالتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب کوئی فوت ہو جاتا تو سائیں اپنے گروپ کا براہوی زبان کا مشہور فقرہ دہراتا تھا؛ ''بڑ زاہنانے'' (اوپر چلا گیا)۔ اسی طرح زندگی کے دکھوں اور زمانے کی ناروائیوں کی بات کرتے کرتے کمال خان اور اس کے دوستوں کا ایک اور محبوب فقرہ تھا بلوچی میں؛ ''شے حالاں مرغ جوانیں ژہ ڈکھاں زندغی ایغاں'' (زندگی کی اس دکھوں بھری حالت سے تو مرنا بہتر ہے)۔ افراتفری اور انارکی کے لئے وہ ایک مشہور براہوی جملہ ادا کرتا تھا؛ ''خلیسہ و پرغیسہ'' (ماردو گے اور پاش پاش کردو گے)۔ سندھی زبان کا، ''رکھ اللہ تے'' (اللہ پہ رکھو) تو سمجھئے ان لوگوں کا محبوب ترین جملہ ہوتا تھا۔ سائیں کمال خان شیرانی کا خوبصورت تکیہ کلام یوں تھا؛

"Wisdom comes through sufferings"

(دانائی دکھوں کے راستے سے ملتی ہے)

میں یہ مضمون اردو کے بجائے اگر بلوچی یا پشتو میں لکھتا تو ضرور بتاتا کہ ہمارے درمیان کیا کیا slangs مروج تھے۔ مگر اردو میں یہ ساری باتیں ممانعات ومنکرات میں آتی ہیں۔ اس لئے آؤ

اردو میں سائیں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔

کمال خان بہت راست گو شخص تھا۔ جھوٹ اُس سے کوسوں دور تھا۔ مگر دوسروں کے لئے وہ ایک خوبصورت فقرہ کہتا؛ ''سچ صرف دو لوگ بولتے ہیں؛ یا زور آور، یا پاگل''۔ اور جب ہم اسے یاد دلاتے کہ آپ تو خود سچ بولتے رہتے ہیں تو وہ پشتو میں یہ خوبصورت فقرہ بولتا؛

''آختہ یم'' (میری تو شامت آئی ہوئی ہے)۔

میں اُس کی ایک ادا سے تو حد درجہ متاثر تھا۔ اور ہمیشہ میری خواہش ہوتی ہے کہ میں کمال خان کی اس خوبصورت عادت کی پیروی کروں۔ آپ جب بھی اس سے پوچھتے کہ؛ ''کیا حال ہے؟'' تو وہ جواب میں ہمیشہ کہتا؛ ''شُکر و نہ باسم'' (شکر ادا کرتا رہتا ہوں)۔ اس قدر اطمینانِ قلب۔ اس قدر شانت، صابر، شاکر!! بلاشبہ ایسی نعمت تو اسی کو ملتی ہے جس نے ساری زندگی انسانی عظمت کی بحالی کا بلند عزم کیے رکھا اور اس کے لئے زندگی بھر جدوجہد کی۔ بڑے انسانی آدرش انسان کی روح کو سکون بخشتا ہے اور دل ودماغ کو اطمینان عطا کرتا ہے۔

ایک بار الیکشن کے موقع پر سائیں کے ساتھی اور اُن کے مخالف ملاّ امیدوار اپنے اپنے ساتھیوں سمیت بہ یک وقت ایک ووٹر کے گھر پہنچے۔ کھانے کے وقت سائیں کے ایک ساتھی کی ملاّؤں کے لیڈر سے بحث چھڑ گئی اور بہت تلخ صورت حال پیدا ہوگئی۔ جمہوریت میں ووٹ مانگنا ہوتا ہے کوئی قتل وغارت تھوڑی کرنی ہوتی ہے۔ چنانچہ سائیں نے فی البدیہہ ملاّؤں کے لیڈر سے پشتو ضرب المثل کا اردو بنا کر استعمال کر دیا اور دیکھتے دیکھتے لڑائی کے بجائے محفل زعفران بن گئی۔ انہوں نے کہا؛ ''ملاّ صاحب، کس کے ساتھ سپید کرتا ہے!''۔ (یعنی اس شخص سے کیا الجھنا!)۔

کمال خان کے سامنے جب آپ اپنا کوئی مسئلہ پیش کرتے تو ایک اچھے سامع کے بطور وہ آپ کو بہت غور سے سنتا۔ اور اپنی سوچ کے مطابق اچھا حل بتاتا۔ وہ آخر میں امید بھرا یہ فقرہ ضرور کہتا؛ ''خدا خیر کرے گا''۔ مگر جب کوئی دوسرا بے پرواہی میں، اور کچھ نہ کرنے کی نیت سے یہ فقرہ بولتا تو وہ فوراً ٹوکتا؛ ''تم خود بھی کچھ کرو۔ خیر خدا پر مت چھوڑو اس لئے کہ خیر اور شر دونوں ہی اُس کے قابو میں ہیں''۔

ایک بار تبلیغی اس کے پاس گئے اور اسے تبلیغ میں بھرتی کرنے کی تقریر کرتے رہے۔ سائیں نے انہیں سنا اور سو باتوں کی ایک بات کہہ کر انہیں خاموش کر دیا؛ ''یہ جو بدامنی اور بے برکتی ہے، نااتفاقی اور فتنہ فساد ہے، اس ساری برائی کی جڑ روپیہ ہے۔ اور روپیہ کافر مذہب سے ہے۔ روپیہ کو مسلمان بناؤ سارے مسئلے حل ہو جائیں گے''۔ (پرودھون نے دو سو سال پہلے کہا تھا ''جائیداد اور پیسہ ایسے خدا ہیں جن کی اپنی دینیات ہوتی ہے اور اپنی اخلاقیات'')

سائیں کمال خان کے وطن میں غازی، جہاد، غزہ اور شہید کے الفاظ گویا روزمرہ کے الفاظ ہیں۔ ملاّ گذشتہ دو صدیوں سے انہی الفاظ کے گرد پورے معاشرے کو چلا رہا ہے۔ ہزاروں لوگ ملاّ کی باتوں میں آ کر افغانستان کی تباہی سے لے کر خودکش بمباروں تک میں کام آئے۔ مگر اس پس منظر میں ایک بات تو صرف سائیں ہی جانچ سکتا تھا۔ اور بڑے خوشگوار انداز میں بیان کرتا تھا؛ ''ہمارے معاشرے میں مولوی صاحب کی قسمت میں شہادت والی جنت نہیں ہے''۔ اس کا مشاہدہ تھا اور کس قدر درست مشاہدہ تھا کہ؛ ''آپ پوری محفل میں ہاتھ ملاتے جائیں جس شخص کا ہاتھ سب سے زیادہ نرم ہوگا، وہ ملاّ ہوگا''۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ضیا کے دور میں مدرسے بہت زیادہ کھلنے لگے۔ سعودی بادشاہ نے ملاّ پروڈیوسنگ فیکٹریوں کا ایک جال بچھا دیا۔ مگر سائیں کو کچھ تشویش نہ تھی۔ وہ چلتے چلاتے میں تباہ کن تجزیہ پیش کرتا؛ ''اچھا ہے۔ جب مارکیٹ میں مولیاں زیادہ ہوں گی تو سستی بکیں گی۔ ڈاکٹروں کی طرح ملاّ زیادہ ہوں گے تو اُن کی قدر کم ہوگی' ڈیمانڈ اور سپلائی کے کلیہ کے مطابق اِس کمادٹی کی مقدار جتنی زیادہ ہوگی، اس کے ریٹ اتنے ہی کم ہوں گے''۔

ملاّ محمد خان شیرانی ایک زمانے میں سائیں کمال خان کے رفیق و ہمسفر رہے (میں اُن کی شان کے پیش نظر انہیں سائیں کا شاگرد نہیں کہہ رہا)۔ وہ بعد میں بالکل اُلٹ راہ پہ روانہ ہوئے اور سائیں کی سیاست کے بدترین مخالف بنے۔ سائیں نے انہیں ہمیشہ ہر محفل میں ہدفِ تنقید بنایا۔ حتیٰ کہ ایک بار ایسی معصومیت سے ان کے خلاف بولے کہ مولوی صاحب کا چھوٹا بھائی بجائے ناراض

ہونے کے بے اختیار مسکرا دیا۔ اور ایک وقت تو کمال خان کو گویا غیب سے مولوی صاحب کے خلاف ایک ہتھیار مل گیا۔ وہ مولوی محمد خان کے بارے میں نواب اکبر بگٹی کے مشاہدے کو ہمیشہ دھراتا تھا۔ اس کے بارے میں نواب کے تاثرات کو وہ یوں بیان کرتا تھا؛ ''یہ شخص بھی عجیب ہے۔ سارا وقت' اگر، مگر، چونکہ، چنانچہ، اور لہٰذا' میں گزار دیتا ہے''۔

ژوب کے ایک مشہور سردار ہوا کرتے تھے، سردار اختر۔ بہت کروفر اور ہیبت والے سردار۔ ایک تقریب میں سائیں سے کہنے لگے؛ ''آپ کی سیاسی پارٹی اچھی ہے مگر یہ سرداروں کی مخالفت سے باز نہیں آتی''۔ سائیں نے برجستہ کہا؛ ''نہیں سردار، جب سے ہم نے ملاؤں کے مظالم دیکھے ہیں تو سرداروں کو غنیمت جانا ہے''۔

ہمارا دوست حفیظ شیرانی ایک بار سائیں کے ساتھ ڈیرہ اسمٰعیل خان گیا۔ وہ علاقہ مولوی فضل الرحمٰن کا ہے۔ اور مولوی صاحب کی پارٹی کے خلاف ہی تو سائیں کی پارٹی ہر بار الیکشن لڑتی ہے۔ دونوں باہم مخالف سیاسی پارٹیاں ہیں۔ حفیظ بتاتا ہے کہ سائیں بازار میں جب بھی کوئی چیز خریدتا تو خوب مول تول کرتا۔ اور جب آخر میں خریدنے لگتا تو دکاندار سے کہتا؛ ''اگر تم مجھے سودا مہنگا بیچ رہے ہو تو خدا ملاّ فضل الرحمٰن سے پوچھے گا''۔ دکاندار پہلے تو ہکا بکا رہ جاتا اور پھر سنبھل کر مسکرا دیتا۔

سائیں اکثر اوقات الفاظ کو ڈی کنسٹرکٹ کر کے مطلب نکالا کرتا تھا مثلاً خدا، پشتو لفظ خہ (اچھا) اور دا (ہے) یعنی ''اچھا ہے'' ہوتے ہوئے ''خہ دا'' یعنی خدا بن گیا۔ یعنی اچھائی کی علامت۔ اسی طرح لفظ بازار، ''بہ آزار''۔ دکھ بھرا۔

اگر کوئی سائیں سے اِس سرزمین کی بدقسمتی کی وجوہات پوچھتا تو وہ اِس قدر فی البدیہہ، اختصار اور تیر بہ ہدف وجہ بتاتا کہ مزید کسی کنفیوژن کی ضرورت نہ رہتی۔ وہ بس اقبال کے شعر کا یہ مصرع دہرا دیتا؛

ما کُشتۂ ایم سلطانی و ملا و میری

پس ماندہ سماجوں میں فکر کو باقاعدہ پروگرام بنا کر پھیلانا شاذ و نادر مہارتوں میں آتا ہے۔
اور ہمارا سائیں کمال خان بلاشبہ نایاب مہارتوں کا مالک تھا۔ یہ بات کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ سائیں کمال خان شیرانی بلوچستان میں سماجی سائنس کا سب سے بڑا (جی ہاں سب سے بڑا) استاد تھا۔ وہ پراگریس، انسان دوستی، اور برادری بھائی چارے کا پیامبر تھا۔ سائیں ایک عوامی ایجوکیشنسٹ تھا۔ اس کی اپنی نرالی، مخصوص، اور ممتاز طرز تھی۔ سائیں کمال خان بلوچستان کی تاریخ میں سب سے انوکھا اور سب سے یکتا استاد تھا۔ اور اس کی پہلی یکتائی یہ تھی کہ وہ پورے بلوچستان کا استاد تھا۔ اس کے شاگرد اگر ہر ضلع میں نہیں تو کم از کم ہر ڈویژن میں ضرور پائے جاتے ہیں۔

دوسری یکتائی یہ تھی کہ اس نے شاگردوں کی ایک ایسی پوری نسل تیار کی تھی جس میں ستر سالہ بوڑھوں سے لے کر 12 سالہ نوجوان تک شامل ہیں۔

سائیں کمال خان میں دلچسپ عادت یہ تھی کہ وہ نوجوانوں میں بہت آسانی سے گھل مل جاتا تھا اور انہی میں مقبول تھا۔ وہ جس بھی نئے نوجوان سے ملتا تو اُس کا تذکرہ ہر جگہ کرتا۔ اس کے مطالعے کی عادت کا، اس کے پسندیدہ موضوعات کا اور اس کے ساتھ کی گئی بحث مباحثے کا۔ گویا ایک ہی دن میں اس نئے نوجوان کا تعارف سائیں کے سارے ملنے والوں سے ہو جاتا۔ حاضرانہ یا غائبانہ۔

وہ اُس نوجوان کو کتابیں تجویز کرتا تھا۔ اسے اچھے لوگوں سے ملنے کی تلقین کرتا تھا۔

سٹیزن کمال خان کا رشتہ و رابطہ چونکہ نوجوانوں سے تھا، اس لئے وہ اُن کے ''معاملات'' کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لئے کہ ہم لوگ اپنی باتیں اُس سے بلا جھجک کر ڈالتے تھے۔ عشق کے معاملے میں وہ لکھنو کی پاک پاکیزگی والے جاگیرداری کلچر کے ساتھ نہ تھا بلکہ وہ ہمیشہ عام بلوچ اور پشتون فطری اور ماقبل جاگیرداری کلچر کی مطابقت میں سوچتا تھا.....اس کے نصاب میں عشق و محبت ممنوعہ علاقے نہ تھے۔

کمال خان محفل میں، یا تنہائی میں کبھی بھی کسی غلطی پر آپ کو ٹوکتا نہ تھا' وہ آپ کو کبھی غلط نہ کہتا، وہ کبھی بھی آپ کی غلطی پکڑتا نہ تھا۔ وہ تو بہت بعد میں بہت دور سے موڑ کاٹتے ہوئے ایسے طریقے

سے آپ کی اصلاح کرتا کہ آپ کی عزتِ نفس بھی مجروح نہ ہوتی اور آپ آٹو میٹک انداز میں خود کو درست بھی کر لیتے (ماسوائے اُن لوگوں کے جن کے دلوں، کانوں، اور آنکھوں پر مہر لگی ہوتی تھی)۔

کمال خان شیرانی شاہی فرمانوں یا ملاؤں کے فتوؤں کے طرز پہ شعور نہیں پھیلاتا تھا۔ نہ لمبا وعظ فرماتا اور نہ ہی پر جوش تقریر کرتا۔ بلکہ عام فہم بات کرتا تھا۔ عام فہم اقدام کرتا۔ وہ چونکہ خود عام آدمی کا طرزِ بود و باش رکھتا تھا اس لئے عام آدمی میں جلد گھل مل جاتا۔ اس کی باتیں عام لوگوں کو سمجھ آتی تھیں۔ بہت اعتدال سے، اطمینان سے اور دوستانہ طرز سے گپ شپ میں دل جیت جاتا تھا۔ سائیں دو تین آدمیوں سے زیادہ کی محفل میں معلّمی سے گریز کرتا تھا۔ عموماً ایک ہی شخص سے گفتگو کرتا۔ وہ بھی گھنٹوں نہیں بلکہ اُس کی سائیکوتھراپی سیشن کے لئے آدھا گھنٹہ ہی کافی ہوتا۔

سائیں بہت ہی اچھا، بہت ہی خوش طبع دوست تھا۔ اس کے ہزاروں پرستار تھے۔ وہ مزاح کا بڑا اعلیٰ اظہار کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو طنز کی حد تک چبھتا ہوا مزاح۔ اسی مزاح سے تو وہ لوگوں کی تربیت کرتا تھا۔ دوستوں میں ہوتا تو فارمل کبھی نہ بنتا اور نہ ہی فارملٹی رہنے دیتا۔ محفل یک دم بہت ری لیکس ہو جاتی تھی۔

کمال خان قدرتی مناظر و حسن پہ عاشق تھا۔ ایک بار جب موسمِ گرما میں لاہور آیا تو میں اُسے چڑیا گھر دکھانے لے گیا۔ اُس شام آسمان پہ بادل تھے اور موسم بڑا خوشگوار تھا۔ گھومتے گھومتے ہم جب مور کے پاس آئے تو وہ اپنے پر پھیلائے ناچ رہا تھا۔ ایک تو مور خود بہت خوبصورت ہوتا ہے اور پھر جب پر پھیلائے رقص کر رہا ہو تو پھر تو اس کا حسن ناقابل بیان ہو جاتا ہے۔ دھنک کے سارے رنگ بہت ہی منظّم، منضبط اور متوازن صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ روح خوش ہو جاتی ہے۔ اور آنکھیں ٹھنڈک پاتی ہیں۔ نظارہ مناظر میں ڈھل چکا تھا، موسمی حسن مور کے رقص میں اور مور کا رقص فطرت کے حسن میں مدغم ہو چکا تھا۔ میں انہی پر کیف نظاروں میں گم تھا کہ سائیں پوچھ بیٹھا: ''تمہارا کیا خیال ہے' یہ رنگ یہ حسن بس آٹو میٹک ہیں؟ اس کا خالق کوئی نہ ہوگا؟''۔ اگر جعفر اچکزئی ساتھ ہوتا تو اس کا تو سارا موڈ ستیاناس ہو گیا ہوتا' پوری دنیا کی دِھریت پر ناگاسا کی والا بم لگ گیا ہوتا۔ دلائل،

منظر سب کچھ کرکرا ہو گیا ہوتا.....سائیں ایسی دل آزاریاں کرتا ہی رہتا تھا۔ ایسے موقع پر آپ اسے کیا جواب دے پاتے۔ ایک بہت ہی لطیف اور دلبر لمحے پہ وہ گہری اور گاڑھی بحث شروع کرتا۔

مگر سائیں بہت سوچ کر، ناپ کر، تول کر، جانچ کر ڈنڈا مار دیتا، اس زور سے سر پہ کہ دوسرے تصورات کا بھیجا نکل جاتا مگر وہ خود صحیح سلامت آگے بڑھ جاتا جیسے بھائی صاحب نے کچھ کیا ہی نہ ہو۔ یہ گوریلا گیری، سبک روی، چستی، چابک دستی شاید اس کی قبائلی فطرت کی وجہ سے تھی۔

کمال خان بتایا کرتا تھا کہ جب اس نے اپنے دوستوں کے ہمراہ نوکریاں چھوڑ کر عوامی سیاست کی ٹھانی تو اُن سب نے فیصلہ کیا کہ عوامی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں گے۔ سوال پیدا ہوا کہ کس حد تک؟ تب اُن سب نے طے کرلیا؛ ''at the cost of your blood''۔ بلاشبہ یہ لوگ آخر تک اسی بات پر قائم رہے اور انسان دوستی کا فریضہ ادا کرتے رہے۔

وہ کہتا تھا ''قوم پرستی کا لفظ استعمار کی طرف سے آیا ہوا لفظ ہے۔ ہم قوم پرست نہیں ہیں۔ ہم قوم دوست یا وطن دوست ہیں''۔

ٹالسٹائی نے اپنی کتاب ''بچپن، لڑکپن اور جوانی میں'' میں کہیں ذکر کیا ہے کہ؛

''نمود و نمائش وہ جذبہ ہے جو حقیقی غم کے ساتھ میل نہیں کھاتا لیکن بہت سے لوگوں کی فطرت میں یہ چیز اس بری طرح شامل ہوتی ہے کہ شدید ترین غم بھی اسے دور نہیں کرسکتا۔ غم میں نمود و نمائش افسردہ، غمگین یا ثابت قدم نظر آنے کی خواہش میں ظاہر ہوتی ہے اور یہ پست خواہشات جنہیں ہم تسلیم نہیں کرتے لیکن جو عموماً بڑی بڑی مصیبتوں میں بھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتیں، غم سے قوت، وقار اور سچائی چین لیتی ہیں''۔

معلوم نہیں کمال خان نے اس اقتباس کو پڑھ کر اپنا لیا تھا یا پھر عام انسانوں میں رہ کر اس نے یہ اچھی عادت سیکھ لی تھی کہ وہ غم و مسرت دونوں کیفیتیں بھگتتا تھا۔ اُسے قہقہے لگاتے تو سب نے دیکھا تھا مگر اُسے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بھی بہت سوں نے سنا تھا۔ ایک عام فانی خاکی انسان۔ البتہ دوسروں کے لئے وہ مسیحا تھا۔ وہ دوسروں کی حد سے بڑھی ہوئی خوشی میں کوئی نہ کوئی نقص

نکال کر اپنے دوستوں کو آپے میں رکھتا تھا اور اُن کے غم میں کوئی نہ کوئی امید کوئی نہ کوئی لفظِ حوصلہ اخذ کرکے ڈھارس بڑھانے کا ذریعہ عطا کرتا۔

بلوچستان میں لباس، وضع قطع، گاڑی کا فیشن سب کچھ کراچی سے آتا ہے۔ مگر عقل و دانش کا فیشن یا تو لاہور کے سی آر اسلم بھیجتے رہے یا پھر پسماندہ ژوب کے پسماندہ سلیازی سے سائیں کمال خان برآمد کرتے رہے۔ کتنی مقدس امپورٹ ایکسپورٹ تھی یہ.....! یہی وطیرہ زمانہِ طالب علمی میں ان کے استاد صاحبزادہ ادریس کا اپنے شاگردوں سے تھا۔ وہ بھی اپنے شاگردوں کے لئے کتابیں تجویز کرتے رہتے تھے۔ اور ان کی روحانی ترقی زینہ زینہ کراتے رہتے۔ کمال خان اور عبداللہ جان نے اپنے اس استاد سے بہت کچھ سیکھا اور یہ بھی بعد میں اپنی زندگی اُنہی کے نقش قدم پر گزارتے رہے۔ اچھے استادوں کے اچھے شاگرد!!

نوجوانوں کے رومانٹس ازم کے بتوں کو توڑ ڈالنا تو کوئی سائیں سے سیکھتا۔ وہ بہت محنت سے، بہت استادی کے ساتھ بچتے بچاتے اور احتیاط احتیاط کے ساتھ آدمی کو انسان بناتا۔ میں آپ کو منظر نامہ دکھاتا ہوں؛ آپ شہر کے مشہور اور مصروف ہوٹل (ریگل) میں بیٹھے ہیں۔ ہر میز پہ لوگ بیٹھے چائے نوشی کررہے، گپ شپ کررہے ہیں۔ ٹپ دے رہے ہیں، مہذب و شائستہ بن رہے ہیں، روایت پرستی و قدامت پرستی پہ پھٹکار بھیج رہے ہیں۔ ٹھیکوں کمیشنوں کو تول رہے ہیں۔ انگریزی اور فلسفہ بول رہے ہیں۔ اچانک ایک شخص اپنی کرسی سے اٹھ جاتا ہے اور وہیں اپنی چادر فرش پہ بچھا کر نماز کے دو رکعت فرض پڑھ لیتا ہے۔ جی، یہی شخص کمال خان ہوتا..... بے ساختہ کمال خان۔

سائیں کمال خان کا کمال یہ تھا کہ وہ لمبی بحثیں نہیں کرتا تھا (محبوبہ کہاں لمبی بحث کرتی ہے، یسوع کہاں لمبی بحثیں کرتے تھے، شاہ عنایت، مست توکلی کہاں لمبی بحثیں کرتے تھے؟)۔ سائیں بہت زیادہ اقتباسات بھی نہیں سناتا تھا، نہ ہی وہ پچھم پورب سے دلائل گھسیٹ کر لاتا۔ بس اپنے زرخیز ذہن سے ادبی چاشنی سے بھرپور دو تین فقرے بول دیتا۔ عقل والا سمجھ لیتا اور ہم جیسا ''ماما''، تو بس..... کج بحثی ہی کی خواہش میں اُس پر "degenerated" اور ''غیر مارکسی'' کے القابات لگاتا جاتا۔

اچھی بھلی محفل میں، بھرپور گپ شپ میں کبھی کبھی ایسا دوست بھی اچانک آن دھمکتا جس کی بے دلیل مگر بلند و بھاری آواز سب کو خاموش کرا دیتی تو سائیں ایسے موقع پر فی البدیہہ کہہ دیتا؛ ''A bull in China house!'' اور پھر اُس کا سلیس ترجمہ کر ڈالتا اور یوں محفل گل و گلزار بن جاتی۔

اور اگر کوئی ''علامہ'' بحث کو طول دینا چاہتا تو پھر سائیں نسوار کی اپنی ڈبیا کھول دیتا تھا۔ اور نسوار کی اچھی بڑی (ڈوز) اپنی ہتھیلی پر بچھا دیتا اور تھوڑی دیر تک انگلی سے اس سے کھیلتا۔ ہتھیلی کے زیرو بم کے ساتھ نسوار ایک جگہ مجتمع کر دیتا اور پھر ایک رِدھم کے ساتھ' ایک ہارمنی میں اوپر کی طرف اچھال دیتا جہاں اس کا کھلا منہ یوں اس کا استقبال کرتا اور یوں اس کو Accomodate کرتا کہ عملاً ایک ذرہ بھی نیچے نہیں گرتا تھا۔ آپ ہکے بکے رہ جاتے کہ اب تو اس نے باضابطہ طور پر آپ کے سامنے اپنے منہ میں ''لگام'' دے ڈالی۔ چنانچہ جل بھن کر بحث کا گلہ گھونٹ دو۔ (سائیں کہیں کہیں کسی محفل میں نسوار نہیں کھاتا تھا بلکہ ''انڈین'' ایس بیڑی پیتا تھا۔ نسوار اور بیڑی نے مل کر اس کے پورے دانت بدلوا دیے تھے۔ اور سائیں کے جبڑے کی تجوری میں آخری عمر میں سائنس ہی کے دیے ہوئے دانتوں کا لشکر صف آرا تھا)۔

سائیں بحث چھیڑنے، موضوع بدلنے یا پھر بحث کو بند کرنے کے اور بھی عجیب عجیب گُر جانتا تھا۔ کہاں انگڑائی لینا ہے، کہاں جمائی بھرنی ہے، کہاں نسوار کھانا ہے، کہاں اچانک کتاب اٹھا کر پڑھنی ہے یا کہاں کوئی دلچسپ واقعہ یا لطیفہ بیان کر کے موضوع کو دوسری طرف لے جانا ہے۔ بے شمار بار ہم نے دیکھا کہ رند و لاشار جنگ چھڑنے ہی والی ہوتی اور سائیں ایک ہی فقرے میں فریقین کو سندھ اور ست گھر جلاوطن ہونے سے بچا جاتا۔

انہی اذہانِ تشنہ اور بحث تافتہ پیشہ ور دانشوروں کے جلے بھنے فریق سائیں کو دانشوروں کی صفوں سے خارج بھی کرتے نظر آتے تھے۔ یہ دو چہروں والے بے پیرو بے جماعت ''رولُو'' لوگوں کو میں نے کمال خان کے لئے غیر سائنسی، اگناسٹک، روایت پرست، سڑی ہوئی سوچ کا مالک، اور حتیٰ

کہ رجعتی کا لفظ بھی استعمال کرتے ہوئے سنا۔ مگر یہی ''لاجواب'' لوگ دراصل سائیں کے فلسفے اور اس کی عوامیت کے قوی جادو کی شعاعوں سے مدہوش رہتے۔ زندگی بھر اسے سلام بھی کرتے تھے، ساتھ بیٹھتے بھی تھے اور عجب یہ کہ آہستہ آہستہ اس کے فقروں اور اقوال کو دوسری محفلوں میں اپنا بنا بنا کر دوسروں کو سنانے بھی لگتے تھے۔

ہاں، البتہ کبھی کبھی بات اس کے برعکس بھی ہوتی۔ رسم و رواج، جرگہ، مرکہ، غم، شادی .....وہ اتنے کرخت و قبیح قبائلی قصے لاتا کہ کبھی کبھی واقعی گمان گزرتا کہ سائیں تو بالکل قبائلیت کی دوبارہ بحالی کا طرفدار ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں ٹرائبلزم نے مارا، لتاڑا، گھسیٹا، زدوکوب کیا، چیر کر رکھ دیا اور لوٹ لیا.....اس لئے ہم سب اس نظام کو کسی طرح کی بھی نئی زندگی اور نئی مدد دینے کے لئے تیار نہیں ہیں اور سائیں کا اس فرسودہ دردآور نظام کے بارے میں بار بار کا تذکرہ بہت ناگوار کرتا تھا، گردے کا درد لا گو کرتا تھا۔ اور بہت سے نئے گھبرو ساتھی میں نے دیکھے جو اس کی تعلیمات کے اثر میں آ کر قطعی رجعت، پسپائی اور سائنس و ترقی کی دشمنی کی سرحد میں جا داخل ہوتے۔ اور سائیں کے نیم جوشاندہ کئی ساتھی بڑی بڑی لفاظی اگلتے رہتے۔ فیشن کے بطور نسوار اور تسبیح استعمال کرتے، اور عوامی نظر آنے کے لئے چادر کندھے پر رکھ کر جئے ٹرائبل ازم کا عملی نمونہ بن کر جناح روڈ کے شمال و جنوب کا صفا و مروہ کرتے نظر آتے۔ وہ ملاّ ازم کو ٹرائبل ازم کے ہتھیار سے مارنا شروع کر دیتے تھے جو بذاتِ خود ایک ملاّ ازم ہے۔ سائیں معاملے کو کلیئر تو کرتا تھا مگر بہت لیٹ۔ وہ لگام اس وقت کھینچتا جب نقصان پہلے ہی بھٹہ بیٹھ جانے کی حد تک ہو چکا ہوتا۔ درست ہے کہ بڑے لوگوں کی غلطیاں بڑا نقصان پہنچاتی ہیں!!

سائیں کی محفل میں یہ تو ضروری نہیں تھا کہ لوگ اس میں موجود سارے اس کے ہم خیال بن کر جاتے۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ اس کی محفل میں بیٹھنے کے بعد وہ اس کی بہت سی باتوں کا اثر ضرور لیتے تھے۔ آج اس کے سب سے بڑے سیاسی حریف بھی کسی نہ کسی زمانے میں اس کے سب سے اچھے

شاگرد ہوا کرتے تھے۔

سائیں کمال خان کی بات چیت کا ایک خاص ڈکشن تھا۔ مزیدار، بے ساختہ، فوک آمیز، برجستہ، بے باک، محاورہ بننے کے لائق.....اور دلچسپ یہ کہ اُس کے قریبی دوستوں میں یہ ڈکشن باقاعدہ جذب ہوگیا ہے۔ اور باتوں باتوں میں آپ کو لگتا ہے کہ ارے یہ تو کمال خان کا سٹائل ہے، ہمارے محبوب کا اسلوب ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر سائیں کے فرمودات اور اقوال کو اکٹھا کیا جائے تو بلاشبہ عقل وخرد کا ایک گلستانِ سعدی، ایسوپ کی کہانیاں، رومی کی حکایتیں، ملا نصر الدین کی سبق آموز باتیں، وتایو فقیر کی دانش مندی، بہارستان جامی، کلیلہ ودمنہ تشکیل پا جائے جن کی کتاب ہر گھر میں ہر بچے کو پڑھائی جائے گی۔

سائیں دانشور کو ''دانشخور'' کہتا تھا۔ انٹلکچوئل کو ''انٹل کچوئل''، تعلیم یافتہ کو ''تعلیم تافتہ'' اور ملاّ کو ''مردار خور'' کہتا تھا۔ وہ ملاّؤں کو تیار خور کہتا تھا اس لئے کہ اُن کے ہاتھ محنت سے کھردرے اور سخت نہیں ہوتے بلکہ ریشم کی طرح نرم نرم ہوتے ہیں۔

سائیں پیشہ ور بحث زدہ لوگوں کو Chattering Class کہتا تھا۔ وہ کردار کے بجائے گفتاری کمیونسٹوں کو ''کوا'' کہتا تھا۔ جو سارا دن کائیں کائیں کرتے نہیں تھکتے مگر ان کی لفاظی کا کوئی اثر نہیں نکلتا تھا، نہ خود پر اور نہ مخاطب پر۔

کمال خان سویت یونین کے آخری برسوں میں وہاں بیوروکریسی کے غلبے کو شدت سے محسوس کرتا تھا۔ بہت خوبصورت طنز کے ساتھ سٹالن اور برژنیف کا ذکر کرتا تھا۔ وہ مجھ سے باتوں باتوں میں روس کے حوالے سے اُس پہ ''تمہارا مکہ'' کہہ کر طنز کرتا تھا۔ اصل سوویت یونین سے اس کی مراد لینن ہوا کرتا تھا۔ بعد کی ساری غلطیوں پر تو وہ ہنستا تھا۔

کمال خان شیرانی سقہ بند سوشلزم سے قطع تعلق رکھ کر بھی نجی ملکیت کے سخت خلاف تھا۔ نجی ملکیت خواہ جائیداد کی شکل میں ہوتی، پیسوں کی شکل میں ہوتی یا شہرت ونام کی ہوتی۔ وہ تو بس؛

ناکر بندے آمیری میری

ناں تیری ناں میری

چار دناں دا میلہ دنیا

فر مٹی دی ڈھیری

کا مجسم نمونہ تھا۔

کمال خان کا فلسفہ بہت سادہ اور عام فہم تھا۔ ژوب کے اکرام اللہ راوی ہیں کہ ایک شخص نے سائیں سے پوچھا کہ آپ کا فلسفہ اور سوشلزم ہے کیا، ذرا مجھے بھی سمجھا دیں۔ تو سلیازی کے سقراط نے اُسی سوال کرنے والے سے ایک سوال کیا اور قصہ ختم کر دیا۔ سوال یہ تھا؛ ''کیا ساری دنیا کا پیسہ تمہیں ایک شخص کی جیب میں اچھا لگتا ہے یا سب لوگوں کی جیبوں میں؟'' اس نے کہا؛ ''سب لوگوں کے پاس''۔ سائیں نے کہا؛ ''یہی سوشلزم ہے''۔

ایک اور شخص نے اسلامی بینکنگ کے بارے میں پوچھا تو سائیں کا جواب تھا؛ بنک تو ایک طوائف ہے، آپ اس کے ساتھ جس طرح کے بھی پاک وصاف الفاظ لگا دیں یہ نیک نہیں ہوتا''۔

بنیاد پرست کمیونسٹوں کو تو وہ آڑے ہاتھوں لیتا تھا۔ اگلا بہت خضوع وخشوع سے اس بوڑھے شخص کو پارٹی میں بھرتی کرنے کے دلائل دے رہا ہوتا کہ اچانک وہ ان باتوں کو ''تمھارا سوشلسٹی رواج'' کہہ کر سارا سکور بورڈ مٹا دیتا۔

سائیں کے طرز طریقے شہری یا جدید مارکسسٹوں والے بالکل نہیں تھے حتیٰ کہ کبھی کبھی مارکسسٹ تو کیا، وہ مارکسزم مخالف نظر آتا۔ وہ ایسی باتیں کر جاتا کہ مارکسزم کے ملاّ اُس کے عقیدے پر شک کرنے لگتے۔ اچھی باتیں کرتے کرتے اچانک پٹڑی سے اتر جاتا' ساری ہوائی باتوں کا بیڑہ غرق کر جاتا۔

مغرب کو وہ "greedy" کہتا تھا۔ وہ اس کنزیومر سوسائٹی سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اُس کی نظر میں یہ "Throw-away" کلچر تھا۔ اُس کا ایمان تھا کہ مشرق روحانی طور پر مغرب سے سیکڑوں سال آگے ہے۔ اس کا خیال تھا کہ مغرب کی سائنس وٹکنالوجی کو مقامیائے بغیر نافذ کرنا

تباہ کن ہوگا۔ وہ مغرب سے اپنی نفرت کے لئے اس موضوع پر اقبال کے سارے اشعار زبانی اور برمحل سنایا کرتا۔

سائیں کمال خان کو این جی اوسمیت مغرب کی ہر اُس بات اور ادارہ سے نفرت تھی جو اپنی ہر ادا کو استاد بن کر انسانوں کو ترقی سکھانے کا مشن جتلاتے تھے۔ وہ انہیں کیریئر اِسٹ اور Mediocre بتاتا تھا۔ وہ طنز میں این جی اوز کے بارے میں کہتا تھا؛ ''یہ ہمیں حجامت کرنا سکھا دیں گے؟''۔ یا ''جب بھی آپ لوگوں کو دیکھتا ہوں مجھے قندہار کے نائی یاد آتے ہیں''۔

کمال خان یہاں ہمارے معاشرے میں مغرب زدگی سے شدید نفرت کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ مغرب کی مادی نقل تو ہر طرف موجود ہے مگر مغرب کی عقل کی نقل کہیں نہیں ملتی۔

اُردُو اور پنجابی

سائیں کمال خان بہت اچھی اردو بول اور لکھ سکتا تھا مگر بولتا نہیں تھا۔ اُس کے خیال میں اِس زبان کی سرشت میں غلامی، رجعت اور جبر گندھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ کوشش کرتا تھا کہ پشتو ہی بولے۔ وگرنہ مجبوراً انگریزی کو ترجیح دیتا تھا۔ اور جب بالکل کوئی اور چارہ نہ ہوتا تو پھر اردو میں بات کرتا۔ انگریزی اس کی بہت اچھی تھی۔ فارسی ظاہر ہے کہ بلوچستان کے ہر عالم کی علمی زبان ہے۔ پھر یہ لوگ اقبال سے بہت متاثر رہے تھے اور اقبال نے اصل شاعری کی ہی فارسی میں ہے۔ سائیں فارسی پڑھتا بھی تھا، سمجھتا بھی تھا۔ اور وہ ہر اچھے پڑھے لکھے انسان کی طرح فارسی مقولے، مصرعے اپنی گفتگو میں خوب استعمال کرتا تھا۔ سعدی اور حافظ کی خوبصورت، امیر، شستہ اور مبارک فارسی۔

ہم بتا چکے ہیں کہ سائیں کمال خان کو اردو بولنے والوں سے کچھ زیادہ امیدیں اور دوستی نہ تھی۔ وہ اس زبان کو ایک رجعتی اور فیوڈل کلچر والی زبان سمجھتا تھا، اُس کے دانشوروں کو رجعتی اور اُس کے پریس کو Gutter Press کہتا تھا۔

کمال خان اردو والوں کے ''بابائے اردو مولوی عبدالحق'' کو ''ملا عبدالحق'' کہتا تھا۔ ہم میں

سے جو کوئی اردو میں لکھتا تو سائیں طنز سے کہہ ڈالتا؛ ''اگر اردو والوں میں ذرا سی شرم وحیا موجود ہو تو وہ ملا عبدالحق کا ''چغک'' (چوغہ) تمہیں انعام کر دیں''۔

وہ اردو والوں کے خلاف اس قدر نفرت کرتا تھا کہ کئی بار اپنے گہرے دوست عبداللہ جان سے سخت مناقشے میں آ جاتا۔ دونوں کے بیچ تیسری عالمی جنگ چھڑ جاتی۔ عبداللہ جان زبانوں والوں کے اوپری طبقے سے نفرت کے تو حق میں ہیں مگر زبان کی دشمنی کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ مگر سائیں اردو زبان کو محکوموں پر حاکم اور حاکموں کے سامنے سجدہ ریز قرار دیتا۔ اس کے خیال میں یہ لکھنو والے ''صرف باتیں بناتے ہیں''۔

سائیں کو پنجابی انٹلکچوئل سے گھن سی آتی تھی۔ ایک دو افراد کے استثنا کے علاوہ وہ اہلِ پنجاب کے لئے میجر اسحاق سے منسوب ایک فقرہ استعمال کرتا تھا؛ ''جہاں گندم کی فراوانی ہے اور عقل کی کمی ہے''۔ وہ سارے پنجابی دانشوروں کو "degenerated children of Iqbal" کہتا تھا۔ وہ پنجاب اور پنجابیوں کے بارے میں ہو بہو وہی رویہ رکھتا تھا جو کہ بالعموم بلوچوں اور پشتونوں کا ہوتا ہے۔ وہ لاہور کے سی آر اسلم، حفیظ احمد، خواجہ رفیق اور ملک اسلم، فیصل آباد کے میاں محمود اور ملتان کے محمد علی بھارا کے علاوہ سارے اہلِ پنجاب کو محکوم قوموں پہ ظلم، ملک میں مارشل لاؤں اور حکمرانی میں رجعت کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔

کمال خان کی بلوچ دوستی

سائیں کمال خان کو بلوچوں اور بلوچی زبان سے بہت محبت تھی۔ بلوچی فوک لور سے اُس کا ادراک مثالی تھا۔ وہ ہماری تاریخ، تہذیب، کلاسیک اور فوک سے ہمیشہ ٹکڑے سنایا کرتا تھا، خواہ مخاطب بلوچ ہو یا غیر بلوچ۔ مگر سائیں بلوچی بول نہیں سکتا تھا۔ حالانکہ اس کے دوستوں کی اکثریت بلوچ تھی۔ اور اس کی زندگی کا بہت بڑا حصہ بلوچوں کے درمیان گزرا۔ حتیٰ کہ نوشکی کے علاقے میں لوگ انہیں پشتون سمجھتے ہی نہیں تھے۔ وہ وہاں بلوچ کے شناختی لفظ ''میر'' سے مخاطب ہوتا تھا؛ ''میر کمال خان''۔ پھر بھی بلوچی زبان نہ آئے تو حیرت ہوتی ہے۔ سائیں سے پوچھتے تو اس کا کہنا تھا؛ ''بلوچی بہت آسان زبان ہے بہ نسبت براہوی کے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پہلے مشکل زبان براہوی سیکھ لوں' آسان بلوچی تو خود بخود سیکھ جاؤں گا''۔ مگر نہ وہ مشکل براہوی سیکھ سکا اور نہ آسان بلوچی کی نعمت سے سرشار ہو سکا۔ بس کچھ کچھ فقرے یاد تھے، حسبِ موقع کچھ ضرب الامثال ٹکا دیتا تھا اور کچھ مصرعے بہ وقت ضرورت سناڈالتا جن سے اس کی شیریں گفتگو مزید معزز، بھاری اور خوشگوار ہو جاتی۔

کمال خان بلوچوں کی بہت عزت کرتا تھا۔ بلوچ قومی تحریک، اس کے راہنماؤں اور دانشوروں کی توصیف کرتا تھا۔ وہ یوسف عزیز مگسی سے لے کر غوث بخش بزنجو تک ہمارے سب راہنماؤں کو بہت بھاری پن سے یاد کرتا تھا۔ سائیں نواب خیر بخش مری سے بہت احترام وعقیدت رکھتا تھا۔ وہ اُن کے لیے ''آفرین'' اور ''نادر'' کا لفظ استعمال کرتا تھا۔

اسلام آباد کی ریسرچ طالبہ محترمہ عالیہ امیر علی ''بلوچ قومی تحریک کے فیصلہ کن موڑ'' (Turning Point) پر تحقیقی مقالے کے سلسلے میں سائیں سے ہم کلام ہوئیں تو سائیں کا جدلیاتی جواب یوں تھا؛ ''تحریکیں ٹرنز اور ری ٹرنز میں چلتی ہیں۔ تحریکوں میں کوئی ایک ''ٹرننگ پوائنٹ'' نہیں ہوتا۔ تحریک تو ایک جاندار کی طرح ہوتی ہے۔ یہ شروع میں چھوٹی ہوتی ہے اور جوں جوں بڑھتی جاتی ہے یہ بدلتی جاتی ہے حجم میں، صورت میں، اور شباہت میں۔ ایک جاندار کی طرح یہ ماحول کے ساتھ خود کو Adapt کرتی جاتی ہے۔ یہ بیمار پڑ جاتی ہے، تندرست ہو جاتی ہے۔ یہ کمزور ہوتی ہے، توانا ہو جاتی ہے.....ارتقا کرتی جاتی ہے۔''

جب مشرف دور میں فوج میرے بڑے بھائی میر وخان، چھوٹے بھائی عبدالحمید، میرے بھتیجے ظہور احمد اور بیٹے ڈاکٹر طارق کو اغوا کر کے لے گئی تو جس پریشانی میں میرا پورا گھرانہ مبتلا تھا وہ ہم جانتے ہیں یا ہمارے قریبی دوست۔ سائیں کمال خان کو خبر ہوگئی تو اس نے ژوب سے ٹیلیفون کر کے تسلی دی۔ مگر اس کی تسلی کی تلخی اور معنویت تو دیکھیں؛ ''سارے بلوچوں کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم اور تمہارا خاندان بلوچ کارواں میں شامل ہے''۔

آپ کو یاد ہوگا کہ بھٹو کے زمانے میں بلوچوں پر فوج کشی کی گئی۔ طویل جنگ ہوئی جس میں طرفین کا بہت جانی نقصان ہوا۔ بھٹو اپنی روایتی ڈرامہ بازی میں بمباری بھی کرتا تھا اور ساتھ میں لوگوں کو ایک بینڈ والا ریڈیو، کپڑے اور جوتیاں بھی دیتا تھا۔ جس کی وہ اخبارات میں خوب تشہیر کرواتا۔

ژوب کے لوگوں نے جب ایسی خبریں پڑھیں تو انہوں نے ایک جلسہ میں مطالبہ کیا کہ

انہیں بھی ریڈیو، کپڑے اور جوتے دیے جائیں۔ کمال خان فوراً بول پڑا؛

''پہلے بلوچوں کی طرح جوتیاں پہن لو، پھر ریڈیو، کپڑے اور جوتے بغیر مانگے مل جائیں گے''۔

جب ضیاالحق کی طرف سے کی گئی ملاتخم ریزی کی فصل بڑی ہوگئی اور وسطی بلوچستان میں ملاّ گیری بہت ہونے لگی تو سائیں کمال خان اس بات کو تشویش کے ساتھ نوٹ کرتا رہا۔ وہ حکمرانوں کی طرف سے بلوچ معاشرے میں بھی مولوی انڈیل دینے کو بہت بڑا خطرہ گردانتا تھا۔ وہ ملاّ اور جاگیر دار کو بلوچ عوام اور اس کی تحریک کے بدترین دشمن قرار دیتا تھا۔

عوام دوست کمال خان

سائیں کمال خان شیرانی کو عوام الناس سے بہت محبت تھی۔ اس نے اپنی پوری زندگی اپنے عوام کی تربیت کی، اُن کی بہتری کے لئے سوچا۔ اُن کی زبان اور ثقافت میں سب سے بہترین اثاثوں کو محفوظ رکھا۔

وہ اپنی عادت و فیصلہ کے مطابق مزاح آمیز چھوٹے فقروں میں اپنے سماج کے بارے میں بات کرتا تھا۔ اپنی قومی تحریک کی تاریخ پہ کہیں کہیں کمزوری بیان کرتے ہوئے پیار سے ''پٹان بے وقوف'' کہہ جاتا۔

ایک بار کسی چینکی ہوٹل میں صبح کی چائے پی رہا تھا۔ فرش پر بیٹھے پشتون حاضرین آپس میں بحث کر رہے تھے۔ اُن کا موضوع ''بلوچ'' تھا۔ عام آدمی کی دلیلیں بھی تو عام سی، سادہ سی ہوتی ہیں۔ وہ لوگ بلوچوں سے غصے کے اظہار کے بطور انہیں ''اونٹ والے'' کہہ رہے تھے۔

سائیں سے نہ رہا گیا، کہہ بیٹھا؛ ''یارا، اونٹ والوں کو تو چھوڑو، وہ کم از کم قطار میں تو چلتے

ہیں۔ آؤ ہم اپنے بارے میں فکر کریں۔ ہم جو ایسا قافلہ رکھتے ہیں جیسے گدھے، اور وہ بھی جلانے کی جھاڑیوں اور لکڑیوں سے لدے ہوئے گدھے۔ اور تنگ سے دُرے پر اس قدر بے ربط کہ اُن پر لدی ہوئی جھاڑیاں لکڑیاں باہم الجھ کر ایک قدم چلنے تک نہیں دیتیں۔ پشتون قومی تحریک کس قدر الجھا دی گئی ہے۔ اپنی تنظیم سیدھی ہو تو کیا اچھا ہوگا''۔ اندازہ کیجئے وہ باتوں باتوں میں اپنے عوام کو کتنی بڑی بات سکھا گیا!۔

عوام سے محبت اور دوستی سائیں کا مذہب رہا۔ وہ اپنے استاد صاحبزادہ ادریس کی اس نصیت پہ سختی سے کاربند رہا کہ، ''عوام کی خدمت اپنے خون کی قیمت پر کرو''۔ ہم ایک بار ژوب کے ایک دور دراز علاقے میں جا رہے تھے۔ روڈ پر ایک بوڑھے آدمی نے گاڑی کو روکنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے گاڑی روکی اور اسے لفٹ دی۔ راستے میں باتوں باتوں میں اس بزرگ شخص نے سائیں کو پہچان لیا اور پشتو میں کہا؛ ''ارے تم تو وہ پٹانستان والے کمال خان ہو!''۔ خیر گپ شپ چلتی رہی۔ پھر اچانک بڈھے کا اسلام جوش میں آ گیا۔ بپھرتے ہوئے اس نے کہا؛ ''تمہارا باپ بھی پٹھانستان نہیں بنا سکے گا۔ تمہارا باپ بھی اسلام کو نقصان نہیں پہنچا سکتا''۔ ارے تمہیں پیر سُوہری کی مار۔ آیا ہے آگ مانگنے، گھر کا مالک بن بیٹھا۔ میں نے گاڑی روک دی اور غصے سے کہا؛ ''اتر جاؤ ریچھ۔ تم نے سائیں کے والد کا نام لیا ہے!''۔

سائیں نے میرا کندھا زور سے جھنجھوڑ کر مجھے جھڑکا؛ ''یار! یہی ہے تمہاری عوام دوستی؟ چلو میرے باپ کا غم نہ کھاؤ۔ اس نے واقعی پٹھانستان نہیں بنایا ہے''۔ ہم اور بوڑھا آخر تک خاموش رہے۔ مگر جب وہ اپنی منزل تک پہنچا تو سائیں کا ہاتھ چوم کر معافی مانگ کر اپنی راہ پر چل پڑا۔

کُج بُغض دی رِیت وچ نئیں ملدا
اوہارتے جیت وچ نئیں ملدا
مخلوقِ خدا نال پیار تے کر
رب صرف مسیت وچ نئیں ملدا

سائیں نے ایک بار کہا تھا کہ اس کے قبیلے شیرانی کا ایک شخص اس کے ساتھ بیٹھا تھا اور پورا ایک گھنٹہ گپ شپ ہوتی رہی۔ آخر میں اس شخص نے کہا؛ ''کمال خان! ہم شک من (شک کرنے والے) لوگ ہیں، ایک دوسرے کی باتوں پر یقین نہیں رکھتے، بہت دیر سے آپ کو سن رہا ہوں لیکن اب جا رہا ہوں۔ اِسی لئے جاتے جاتے مجھے بتا دو کہ اِن باتوں سے تمہارا اصل مقصد کیا تھا''۔ سائیں نے کہا کہ میں بے حد حیران ہوا کہ ایک گھنٹے سے اپنے صحرائی عزیز اور رشتہ دار کو سمجھا رہا ہوں اور وہ نہیں سمجھتا۔ اُس کے خیال میں میری ہمکلامی بے مقصد تھی اور ایک گھنٹے سے میں اُس کے ساتھ گپ شپ کر رہا ہوں اور آخر میں وہ مقصد کی بات کرنے کا آرزومند ہے، حالانکہ میں نے ساری باتیں مقصد کی اُس کو کہیں۔

اچھی عادتیں

خلیل جبران نے کہا تھا؛ ''وہ ہمدردی جو ہمسائے کا دل موہ لے، راہب خانے کے ان دیکھے گوشوں میں چھپی ہوئی نیکی سے برتر ہے۔ ناتواں مجرم، یا طوائف سے مہربانی کا جو بول بولا جائے وہ اُس لمبی دعا سے زیادہ شاندار ہے جو ہم ہر روز معبد میں کھوکھلے پن سے کرتے ہیں''۔

کمال خان شیرانی، رحمٰن بابا سے بہت متاثر تھا۔ وہ اس کے اشعار اکثر و بیشتر دہراتا رہتا۔

سائیں بہت صفائی پسند انسان تھا۔ وہ اپنے بناؤ سنگھار سے نفرت کرتا تھا مگر خود کو Presentable ضرور رکھتا تھا۔ کپڑے صاف ستھرے ہوتے تھے۔ وہ اپنی داڑھی بے قینچی اور بے کنگھی کبھی نہ رہنے دیتا۔

کمال خان کا گھر کچا تھا۔ ساتھ میں ایک مہمان خانہ تھا۔ آٹھ دس سال قبل تو یہ مہمان خانہ بھی موجود نہ تھا بس انگور کی بیلوں سے بنی ایک نشست گاہ تھی۔ مہمان خانے کے وسیع احاطے میں پہاڑوں سے پتھروں کی رنگین قدرتی چپٹی Slabs اپنی پشت پر ڈھوڈھو کر اس نے ان سے ایک وسیع چوکور نشست گاہ بنائی۔ یہ رنگین چپٹے پتھر صوفے کی طرح پشت پر اور نشست گاہ میں بہت ترتیب اور

خوبصورتی سے فکس کر دیے گئے اور اُن کے پیچھے انگور کی بیلیں لگا دی گئیں۔ انہی انگوروں سے دیوار بنی اور پھر انہی انگوروں کی بیلوں سے وسیع چھت بن گئی ..... اس قدر خوبصورت تخلیق کار تھا میرا دوست، سائیں کمال خان شیرانی۔

سائیں موسیقی پسند کرتا تھا۔ جب بھی گاڑی میں بیٹھتا اور خواہ کیسی سنجیدہ بحث ہوتی وہ اچانک رک جاتا اور ٹیپ ریکارڈر کی طرف اشارہ کر کے کہتا؛ ''داوژغوہ'' (اس سے کچھ کہلواؤ) یعنی کیسٹ آن کرو۔ ہم اس سے کہتے آپ تو سنتے نہیں۔ مگر وہ آنکھیں میچ کر اشارہ کر کے موسیقی چلوا لیتا۔ ظاہر ہے اسے پشتو موسیقی پسند تھی یا پھر فارسی۔ اسے ناشناس بہت پسند تھا کہ اس کی آواز تو اچھی تھی ہی اس کا انتخابِ کلام بھی بہت اچھا تھا۔ رحمٰن بابا بھلا کسے اچھا نہیں لگتا، غنی خان بھلا کسے اچھا نہیں لگتا، اقبال بھلا کسے اچھا نہیں لگتا، ناشناس بھلا کسے اچھا نہیں لگتا، ٹکر بھلا کسے اچھا نہیں لگتا۔ مگر سائیں کو تو وہ خصوصاً بہت زیادہ اچھے لگتے تھے۔

اسے پھولوں سے بڑی رغبت تھی۔ اپنی بیٹھک میں وہ ایک ایک بوٹے کے گرد (خواہ جنگلی خودرو ہو یا سائیں کے ہاتھ کا لگایا ہو) پتھروں کی حفاظتی دیوار بناتا، خود برتن بھر کر پانی پلاتا رہتا۔ حسن کی تعریف کوئی اس سے سیکھتا۔

ایک بار جب میرے گاؤں آیا تو یہ بہار کا موسم تھا۔ وہ پہاڑی خودرو پھول ڈھونڈ ڈھونڈ کر سونگھتا، رنگ دیکھتا اور مجھ سے بلوچی میں ان کا نام پوچھتا۔ اُسے خصوصاً ''پرپغ'' کا پھول بہت پسند آیا تھا جو اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اور جب میں نے اس پھول کو بلوچی شاعری میں استعمال کردہ تین چار شعر سنائے تو وہ تو گویا جھوم اٹھا تھا۔ گُل کمال خان!!

بلوچستان کا یہ کاکا صنوبر حسین باقاعدہ نمازی اور روزہ دار تھا۔ وہ نماز بھی بہت دلچسپ انداز میں پڑھتا تھا۔ اس کی پہلی خاصیت یہ تھی کہ وہ نماز قضا نہیں کرتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ وہ نماز حتیٰ الوسع باجماعت نہیں پڑھتا تھا۔ اسے کوئی ملاّ اس قابل نظر نہیں آتا تھا جو لالچ، نام و نمود اور سیاست کی لت (Lust) میں اولمپین نہ ہو۔ سب تاجر ہیں۔ اس کے خیال میں پادری یسوع کا نام بیچ

کر خرمستیاں کرتا ہے، پنڈت تلک لگا کر نند لال بن جاتا ہے، ملاّ مافیا قائم کر کے بادشاہت کرتا ہے۔ اس لئے سائیں جمعہ کی نماز کو ظہر بنا کر ادا کرتا تھا۔ اس کی نماز لمبی ہوتی تھی نہ اس کے سجدے طویل ہوتے تھے..... بہت مختصر، ٹو دی پوائنٹ۔ نہ نماز کے بعد انگلیوں پر کچھ پڑھتا تھا نہ تفصیل سے کوئی دعا مانگتا تھا۔ نہ پانچے ٹخنوں تک چڑھاتا تھا، نہ جائے نماز منقش مانگتا تھا۔ بس ایک ڈیوٹی تھی جسے وہ ادا کرتا۔ وہ جس بھی محفل میں ہوتا، جس بھی بڑے سے بڑے دربار میں ہوتا وہیں لوگوں کی موجودگی میں زمین پہ اپنی چادر بچھا دیتا اور اپنی نماز پڑھ ڈالتا۔ حاضرین جو چاہیں تبصرہ کریں، اس کی بلا سے۔ سخت بیماری کے آخری دنوں میں میں نے اسے بیٹھ کر نماز پڑھتے دیکھا۔ اور اپنی زندگی کے آخری پندرہ دنوں میں تو وہ ٹیک لگانے والی بالشت اپنے سامنے رکھتا اور مصلا اِس طرح بچھاتا کہ آدھا مصلاّ زمین پہ ہوتا اور آدھا بالشت پر۔ اس طرح وہ اپنے کندھوں کے درد پر قابو کرتے ہوئے ماتھا زمین کے بجائے بلند بالشت پہ بچھے مصلا سے ٹیکتا اور اپنی نماز ادا کرتا۔

سائیں اپنے روزے بھی پورے رکھتا تھا۔ کمال خان تراویح نہیں پڑھتا تھا۔ وہ ماہ رمضان میں اپنے گھر میں ہی رہتا۔ البتہ رمضان کے لئے وہ ایک خاص ضرور اہتمام کرتا۔ وہ روزوں کے لئے راشن کے بطور بہت ساری کتابیں دو تین ماہ قبل ہی جمع کرنے لگتا تھا اور پھر سارا رمضان انہیں پڑھتا۔

الغرض وہ بہت ہی واجبی ادائیگی کرتا تھا مذہبی رسومات کی۔ مگر کرتا بڑی باقاعدگی سے تھا۔

نہ ہم نے پوچھا نہ ہی اس نے بتایا کہ اس نے حج ادا کرتے وقت تین پتھر کس کو مارے تھے۔ سعودی بادشاہ کو، ولی عہد کو، یا وہاں ہمارے سفیر کو۔ پچھلے سال ہی ہمارے ایک اور دوست حج کر کے واپس آئے تو ہم جب انہیں چھیڑتے یا کوئی غیر مستحسن بات کرتے تو وہ یکدم جیب کی طرف ہاتھ لے جاتے، یہ کہتے ہوئے کہ، ''خبردار، شیطان کو میں نے صرف دو پتھر مارے تھے، ایک بچا کے لایا ہوں''۔ اب یہ پتہ نہیں سائیں نے اپنے سارے پتھر سینر کو وہیں مارے تھے یا کچھ بچا بھی لائے۔

اُس کے حج کا بھی دلچسپ قصہ رہا۔ یہ حج نہ تھا گوریلا کارروائی تھی۔ جب اس کے بہت بڑے بہی خواہ محمود خان اچکزئی نے اس پہ کچھ مہربانی کرنی چاہی تو اس نے اس بار کتابیں نہ مانگیں بلکہ

حج کا خرچہ برداشت کرنے کی غیر متوقع فرمائش کر ڈالی۔ اور یوں سائیں فری بورڈنگ اور فری لاجنگ والا حج کر کے آیا۔ مگر یہ سب کچھ ایسے ہی تو نہیں ہوتا.....اس کے لئے تو کمال خان شیرانی بننا پڑتا ہے.....اور کمال خان ایک دن، ایک ماہ میں نہیں بنتا۔

حج کے نتیجے میں سائیں نے داڑھی رکھی۔ پہلے بالکل چھوٹی سی جسے ''خط'' کہتے ہیں، پھر ذرا سی لمبی۔ اور بعد میں یہ تو معلوم نہیں کہ اس کا چہرہ نورانی کہلاتا تھا یا نہیں، البتہ ریش مبارک وسیع بھی ہوگئی تھی عریض بھی۔ سائیں سے جب بھی کسی نے فوٹو بنوانے کی فرمائش کی تو وہ فوراً بولتا؛ ''گم کرو، مکروہ چہرے کی کیا تصویر کشی کرتے ہو؟''۔ (وہ اپنے چہرے کے لئے خوبصورتی کے متضاد ہر لفظ استعمال کرتا تھا؛ مردار، مکروہ، پشتو لفظ خرن.....) لیکن وہ اس استرے سے پاک صورت میں فلاسفر پکا لگتا تھا۔ میر عبداللہ جان تو اسے ہمیشہ فلاسفر کہتا رہا مگر جب سے باریش ہوا تو وہ واقعتاً اسمِ بامسمیٰ ہوگیا۔

وہ اپنی نماز، حج، روزہ اور ریش مبارک کی کوئی توضیح بیان کرنے کی تکلیف اور تکلف نہیں کرتا تھا۔ بس ہے نا!!! اور اس طرح کے بے شمار کام ہوتے تھے جو وہ اپنی نابغہ مرضی کے مطابق کرتا چلا جاتا اور شاہ دولہ کے دماغ، تمسخر آمیز تبصرے کر کے اپنی دنیا اور عاقبت خراب کیے جاتے ہیں۔ سائیں تو بس حافظ شیرازی کے کلیے پر چلتا تھا کہ؛

حافظؔ وظیفہِ تو دعا گفتن است و بس

در بندِ ایں مباش کہ نشنید یا شنید

میرے وطن کے فلاسفر! میرے وطن کے صوفی! تم اور تمہارا فلسفہ زندہ باد ہوں۔

سائیں کے ژوب اور وہاں سے باہر کے پرانے ساتھیوں کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہوں گا۔ اِس وقت تو میں ان لوگوں کے نام لکھوں گا جو سائیں کی وجہ سے میرے واقف اور پھر محترم دوست بن گئے؛ صوفی نور محمد، گلک، غیاث، الیاس، جانان، نوشیروان، ماما، سردار بہادر خان، خدائیداد اور مولوئی دین محمد۔

یہ سب لوگ اپنے دوست کی طرح گمنام رہے، اپنے کاز کے پیچھے اس قدر غرق کہ نظر نہ آئیں۔ ہمہ دم عوام الناس کی خیر کی آرزو، ہمہ وقت انسانوں کی ذہنی نشوونما کے لیے کوشاں۔

سائیں کمال خان شیرانی کی یاری کسی گردن اکڑے شخص سے کبھی نہ رہی۔ وہ بازاری، ہلڑ باز، مہم جو اور مسخرہ کرداروں سے کبھی بھی متاثر نہ رہا۔ اس کی دوستی اجڑے لوگوں سے رہی۔ اجڑے لوگ، صرف معاشی معاشرتی ہی نہیں بلکہ وہ لوگ جو فطرتاً اجڑے لوگ ہوتے۔ بے شک لکھ پتی ہوں، بے شک 58 گریڈ کے افسر ہوں مگر جن کی سرشت میں اجڑا پن موجود ہوتا۔ جو لوگ اُسے مادی طور پر کچھ نہیں دے سکتے تھے وہی لوگ سائیں کے بہترین دوست ہوا کرتے تھے۔ سائیں چونکہ اپنی ضروریات کو کم کر کے خوش ہوتا تھا۔ اپنے نفس کی خواہشات کو دباتا اور کفایت شعاری، حیا اور انکساری کو اپناتا، لالچ سے دور بھاگتا تھا۔ اس لئے اس کی زبردست پذیرائی ہوتی تھی۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ سائیں کمال خان کو دنیا کی سب سے بڑی نعمت یعنی انسانوں کی صحبت بھرپور نصیب رہی۔

اس شخص کی خصوصیت تھی کہ وہ دھتکارے ہوئے (marginalized) لوگوں سے وفا کیے جاتا تھا۔ جسمانی معذوروں سے یاری کرتا تھا۔ اسی طرح سماج کی طرف سے، ایک فرقے کی طرف سے، ایک پارٹی کی طرف سے نکالے گئے لوگوں سے آخر تک نبھاتا رہا۔ اور یوں وہ پوری مین سٹریم کی اکثریت کو اپنے خلاف کر جاتا۔ مگر کمال خان سب کچھ سے بے پرواہ اپنے اصولوں سے جما رہتا۔

دیکھئے ضرورت کے وقت اگر ایک شخص آپ کا ہاتھ تھامے تو وہ بلاشبہ اچھا دوست ہوگا، مگر کمال خان تو وہ شخص تھا جو آپ کا ہاتھ اس وقت بھی پکڑتا تھا جب آپ آس پاس سے دھتکارے ہوئے ہوں اور آدم گزیدہ ہو کر غصہ سے چلّا رہے ہوں کہ ''مجھے اکیلا چھوڑ دو''۔ کمال خان ریجیکٹ کردگان کا دوست تھا، افتادگان کا دوست تھا۔ بے مسکان چہروں کا دوست تھا۔

غیر محسوس طور پر، بلا احسان کیے کمال خان دکھی دلوں کا دوست بن جاتا تھا۔ پانی کی طرح ہم آہنگ اور نرم دوست۔ آپ کی مایوسیوں کا ساتھی بن جاتا اور پھر، بتدریج آپ میں سر جھٹک کر اُن مایوسیوں سے ٹکر لینے کی وہ طاقت ابھارتا جو عام پانی کو سیلابی پانی کا زور عطا کرتی ہے۔

دوستی اور وفا مجرد الفاظ اور خصوصیات نہیں ہیں۔ دوستی اور وفا کو ایک مکمل پیکیج کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ضروری لوازمات کے ساتھ نہ ہوں تو جاری نہیں رہ سکتیں۔ کمال خان وفا کے پورے پیکیج کو دل کے کاندھوں پہ نوے برس تک اٹھائے پھرتا رہا۔ بن تھکے، بن ستائے۔

کُن معاملہ وایں دلِ شکستہ بہ خر
کہ باشکستگی ارزد بصد ہزار درست

سائیں غصے میں نہیں آتا تھا۔ لوگ اُس پر، اُس کی سیاست پر، اور بالخصوص اُس کی سیاسی پارٹی پر ہمہ وقت تنقید کرتے رہتے۔ مگر سائیں ہمیشہ اُن تنقیدوں کو تحمل سے سنتا تھا۔ اور اگر اُن میں کوئی سچائی ہوتی تو وہ اپنے احباب سے اس کو درست کرنے کے لئے خوب بحث کرتا تھا۔

میں نے اسے بہت کم غصہ میں یا ناراض ہوتے دیکھا۔ مگر ایک روز تو وہ بالکل آپے سے باہر ہو گیا۔ ہوا یوں کہ محکمہ خوراک میں ملازم سائیں کے ایک دوست نے اُس کی دعوت کی۔ ہم کھانے کے وقت اس کے گھر پہنچے۔ وہاں اس شخص نے اپنے اعلیٰ ترین افسر یعنی سیکرٹری کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ (سبی کے رہنے والے) سیکرٹری صاحب نے سرِ شام ہی سے تلخ آب کا بھرا گلاس سامنے میز پر رکھا تھا۔ ہم جب پہنچے تو وہ اس وقت تک دو تین پہلے ہی چڑھا چکا تھا۔ نشہ جوں جوں بڑھتا گیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اُس کی بدبختی آنے والی ہے۔ یہ کج فطرت بیوروکریٹ بحث کی شدید خواہش سے مغلوب ہو کر، گویا ہوا؛ ''سائیں آپ لوگوں نے کیا سیاست کی ہے؟ عوام کو کیا دیا ہے۔ لوگوں کی کیا خدمت کی ہے، وطن کے لئے کیا کیا ہے۔ Bull Shit؟''

بس میں نے دیکھا کہ سائیں کا رنگ یوں سرخ ہوا جیسے کوئی درویش غصے میں کوئی آگ برسانے والی کرامت کرنے والا ہو۔ سائیں کے تیور بدل گئے، اُس کے ہاتھ کانپنے لگے، آنکھیں باہر ابلنے لگیں۔ حانی شہد مرید کی داستان کی مانند دو بار بجلی چمکی اور تیسری بار بادل گرجے؛:

''میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں نے کیا سیاست کی ہے اس لئے کہ

"You people have lost the capacity to understand us

.....کوتاہ بین بیوروکریٹ نے اپنا گلاس ایک گھونٹ میں منہ میں اوندھا کر دیا اور دُم لپیٹ کر بھاگ گیا۔ (یہی سائیں سیاست کی خاطر پچاس کی دہائی میں تحصیلداری سے مستعفی نہ ہوتا تو پتہ نہیں کس کس بیوروکریٹ کا افسرِ اعلیٰ ہوتا، کس ون یونٹ کا گورنر ہوتا!!)

سائیں کمال خان کو استحصال سخت برا لگتا تھا۔ اور معاشی استحصال ظلم کا سب سے بڑا سبب ہوتا ہے۔ وہ معاشی بالا دست لوگوں کو بھوکے کتے (Hungry Dogs) کہتا تھا' جو غولوں کی صورت حملہ کرتے ہیں۔ یہ بالا دست ہنگری ڈاگز کسی بھی چیز پر حملہ کرنے سے نہیں چوکتے۔ خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ۔ وہ اس کو چیرتے ہیں پھاڑتے ہیں اور جو کچھ انہیں ملتا ہے جھپٹ کر لے جاتے ہیں اور بقیہ کو وہیں چھوڑ کر نئے شکار کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ سائیں اِن ''ہنگری ڈاگز'' کو انسانیت، برابری، انصاف، اور انسانی شرف کے دشمن گردانتا تھا۔ سائیں ظالم و مظلوم کا تجزیہ آسان، سادہ مگر بہت گہرے انداز میں کرتا تھا۔ وہ طبقات، اور ان کی خصلتوں کو ایک حسین فقرے میں یوں خلاصہ کرتا تھا؛

''نیستی،
ہستی'
مستی،
خرمستی''۔

کمال خان بے انتہا خوددار انسان تھا۔ جہاں فکری ہم بستگی اور طبقاتی مناسبت نہ ہو اُس در پہ جانا نہیں۔ اپنی اختیار کردہ غربت و سادگی اسے اس قدر عزیز کہ بے شک اس نابغہِ عالم کو دیکھنے اور ملنے کو بڑے بڑے افسر اُس کے گھر جاتے، اُس کے ہاتھوں پتھر سے توڑ توڑ کر صاف کردہ بادام کھاتے، چائے سے لطف اندوز ہوتے، سائیں کی شیریں باتوں سے بہرہ مند ہوتے.....اور جاتے وقت اپنے کارڈ تھما کر آن ملنے کی درخواستیں کرتے۔ مگر سائیں وہ کارڈ اپنی زیرِ مطالعہ کتاب میں اِس نشانی کے بطور استعمال کرتا کہ کتاب کس صفحے تک پڑھی جا چکی ہے.....سائیں دربار

سے دور تھا، درباری گیری سے دور تھا؛

بکوئے میکدہ ہر سالکے کہ رہ دانست
درِ دگر زدن اندیشہِ تبہ دانست

کمال خان کو بے ہنگم شہری زندگی بہت ڈسٹرب کرتی تھی۔ دیہی زندگانی کا یہ دلدادہ شہر میں بہت بے چین سا رہتا۔ وہ شہروں کو ''اژدھا'' سے بھی بدتر قرار دیتا تھا۔ اس لئے کہ اژدھا تو سانس باہر نکالتے ہوئے شعلے اگلتا ہے جبکہ شہر نامی اژدھا اندر سانس لے کر آس پاس کے دیہات، تہذیب، سادگی، اور سچائی کو اپنے اندر ہڑپ کرتا چلا جاتا ہے۔ سائیں کمال خان کو کراچی جیسے بڑے شہروں کی مسلسل وسعت پورے معاشرے کے لئے خطرہ لگتی تھی۔

یہ بتاتا چلوں کہ سائیں جب بھی کوئٹہ آتا تو اس کا یہ دورہ پندرہ دن سے لے کر ایک ڈیڑھ ماہ تک ہوا کرتا تھا۔ جب تک ڈاکٹر خدائیداد زندہ تھا تو سائیں وہیں رہائش کرتا تھا۔ وہ میر عبداللہ جان کے ہاں کبھی نہیں ٹھہرتا تھا، میرے ہاں بھی بہت اصرار کے بعد ایک آدھ دن کیلئے چلا آتا۔ لیکن جب ڈاکٹر خدائیداد کا انتقال ہوا تو وہ ہمارے ایک اور دوست ڈاکٹر واحد کے کمرے میں رہائش رکھتا تھا۔ بعد میں جب ڈاکٹر صاحب نے شادی کی تو پھر سائیں کمال خان نے ہوٹلوں میں ٹھہرنا شروع کر دیا۔ وہ شہر کے وسط میں کسی درمیانہ درجے کے ہوٹل میں مستقل ڈیرے ڈالتا۔ کھانا اکثر پیروکاروں کی دعوتوں میں کھاتا۔ سائیں کی عادت تھی کہ وہ دعوتوں میں اکیلے نہیں جاتا تھا بلکہ ہم دو چار آدمی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ ہوٹل کا کھانا تو اسے زہر لگتا تھا۔ سائیں پولٹری والی مرغی بالکل نہ کھاتا تھا۔ گوشت بھی ہوٹل کا پکا ہوا، یا قصائی کا لایا بہت مشکل سے کھاتا تھا۔ (ہم قبائلی ذبیحہ کے معاملے کو بہت اہمیت دیتے ہیں، حلال حرام کی وجہ سے نہیں بلکہ ذائقے کی بنا پر)۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ذبح کسی صاف ستھرے شخص نے صاف ستھرے انداز میں کیا ہو تو گوشت کا ذائقہ بہترین ہوتا ہے وگرنہ یہ بہت ہی قے آور بن جاتا ہے۔ ہمارے قبائلی لوگوں کو پکے ہوئے گوشت کی شکل اور ذائقے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مویشی ذبح کس طرح ہوا ہے)۔ چنانچہ سائیں کمال خان دال منگواتا تھا، یا جا کر دہی کے

ساتھ کھانا کھا کر آ جاتا، یا پھر انڈہ بنواتا۔

کمال خان کو بسیار خوری اور غیر مہذب انداز میں کھانے سے سخت گھن آتی تھی۔ وہ کہا کرتا؛ ''جب بھی دسترخوان پر کسی کو چپڑ چپڑ کھاتا دیکھتا ہوں تو مزید اُس دسترخوان پہ بیٹھ نہیں سکتا۔ بس کھانے سے خاموشی کے ساتھ ہاتھ کھینچ لیتا ہوں''۔

کتاب اور کمال خان

میں بہت غور کرنے کے بعد یہ فقرہ لکھ رہا ہوں، انتہائی ذمے داری سے؛

'سائیں کمال خان بھائیوں، بیٹوں، دوستوں کے بغیر تو رہ سکتا تھا مگر کتاب بنا، پڑھے بنا ایک گھنٹہ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔'

میری بہت سارے کتاب دوست انسانوں سے رفاقت رہی ہے۔ میں نے کتاب یار، سی آر اسلم کے ساتھ برسوں کی برخورداری کی، عبداللہ جان کی نیاز مندی کی، میر احمد نواز بگٹی کو کتاب چومتے دیکھا، میں نے امریکی کمیونسٹ پارٹی کی نائب صدر انجیلا ڈیوس کو کتابیں چُنتے دیکھا، افغانستان کے عبدالرحمٰن پہوال کی آنکھوں میں کتاب کے تذکرے پر چمکتی بھوک دیکھی، بزنجو صاحب کی لائبریری میں کتابوں کے صفحے قلم اور مارکروں سے زخمی زخمی دیکھے، میں نے کتاب کو اکبر بگٹی کی خواب آور دوا بنتے دیکھا.....مگر جو پکی یاری میں نے کتاب اور کمال خان کی دیکھی، اس کی مثال نہیں ملتی۔ قرطاس وقاری کبھی سرگوشیاں کرتے، کبھی آنکھ مٹکا ہوتا، کبھی مسکان ہلکی نقرئی ہنسی میں بدل جاتی۔ ایک لمحے میں عامل معمول بن جاتا اور معمول عامل۔ تقدس بھرا کمال خان!

میرا دعویٰ ہے کہ سائیں کے ساتھ اُس کے سارے دوستوں کی دوستی بنانے، بڑھانے اور برقرار رکھنے میں بڑی مدد کتابوں نے دی۔ سائیں جب بھی کوئٹہ آتا، ایک نئی کتاب دکھاتا کہ ''اچھی ہے، ضرور پڑھو''۔ اسی طرح جو بھی نئی یا اچھی کتاب اُس کے دوستوں کو ملتی وہ اُسے پڑھ کر سائیں کو دے دینے کو لازمی فریضہ سمجھتے تھے۔ یہ ایکسچینج آخر تک جاری رہی۔

مجھے یاد ہے کہ وہ جب بھی ژوب سے کوئٹہ آتا تو میرے بچوں کے لئے چھوٹے موٹے تحفے لاتا ٹافی، ٹکی، چیونگم، کپڑے کا جوڑا.....۔ بچوں کی طرح میں بھی منتظر رہتا کہ وہ ضرور میرے لئے بھی کوئی چیز لایا ہوگا۔ بالآخر میرا نمبر آجاتا اور وہ اپنے بیگ میں سے نکال کر کوئی کتاب مجھے دیتا۔ جی ہاں، اتنے بڑے کوئٹہ میں رہنے والا شخص ژوب کے پسماندہ پہاڑوں میں سے آنے والے شخص سے ''Latest'' کتاب لے لیتا اور پڑھتا۔ قیامت قریب ہے کہ ''فربہ گائیں، لاغر گائیوں کا دودھ پیتی ہیں''۔ جمالدینی صاحب کی یہ بات کس قدر سچی ہے کہ؛ ''ہم ہزاروں کتابوں کے اندر رہتے ہوئے بھی کچھ نہیں پڑھتے اور وہ بے کتابی میں بھی ہر کتاب پڑھ لیتا ہے''۔

میرے ساتھ تو بہت ہی اچھا تھا، بہت اچھا تھا.....کہ ایک دن بگڑ گیا۔ بگڑ کیا گیا بدک گیا۔ کہنے لگا؛ ''تم اب برنارڈ شا، رسل اور انہی جیسے ادیبوں کو پڑھنا شروع کرو''۔ یہ 1980ء کے ابتدائی برس تھے۔ دل میں یک دم خیال آیا، ''دیکھا نا! اب یہ شخص تمہیں بورژوا لٹریچر پڑھوائے گا، مارکسزم سے نکال دے گا۔ پہلے ہی میرا مڈل کلاسیہ ایمان باریک سا دھاگہ ہے، اب تو مزید کمزور ہو جائے گا''۔ میں نے یار کو ناراض بھی نہ کیا مگر انکار بھی کر دیا۔ چپ کر گیا بیچارہ کہ اس کا جہالت سے واسطہ تھا۔ ''قالو سلاما'' تو وہ بول نہیں سکتا تھا کہ استادوں نے سکھایا ہی نہ تھا۔ اس لئے خاموشی ہی بھلی۔ مگر بکرے کی قسمت تو بالآخر چھری ہی ہے ناں!، چھری نہ ہو تو بکری مردار موت مرتی ہے۔ چنانچہ اگلی بار جب کوئٹہ آیا تو مختصر فقروں میں دلیل دی کہ ''تمہارے کمیونزم کو نہ تو رسل چھینے گا اور نہ ہی برنارڈ شاہ اسے کھا جائے گا۔ بس، تمہاری فکر اور علم کا دامن ذرا سا وسیع ہو جائے گا۔ اس لئے سستی نہ کرو، انہیں پڑھو''۔ تب میں سمجھ گیا اور میں نے ان لوگوں کو پڑھنا شروع کیا۔ اور واقعی ادبی پہلو کی میری کور چشمی

رفع کرنے کا سامان ہونے لگا۔

سائیں یہی داؤ پیچ دوسرے بہت سوں کے ساتھ بھی آزما چکا تھا۔ اور کئی احباب سائیں کی وجہ سے ان مہذب و معتبر ادیبوں سے شناسا ہوئے۔ میں نے پہلے برناڈ شا کی Pygmalion پڑھی اور پھر Man and Superman نامی کتابیں پڑھیں اور پھر اس بحرِ زخّار سے کٹورا کٹورا بھرتا گیا۔ ہر قدح مستی سرمستی تھی، ہر جام علم کا خزانہ تھا اور ہر کتاب ختم کرنے پر سائیں کی رفاقت قابلِ فخر لگتی گئی۔ اور اب تو میں اس دوستی کی چالیس سالگرہیں منانے کا افتخار رکھتا ہوں۔

ایک بار اس کا چھوٹا بیٹا کوئٹہ آیا۔ میں نے فرداً فرداً گھر کے افراد کا پوچھا۔ وہ ہر ایک کے بارے میں تفصیل سے بتاتا رہا۔ میں نے جب پوچھا، ''تمہارے باپ کا کیا حال ہے، کیا کر رہا ہے، آج کل؟''۔ تو وہ بولا ''کچھ نہیں کرتا ہے۔ بس بیٹھا ہے کتاب پڑھتا ہے''۔ (میں نے یہ بات ''بلوچستان سنڈے پارٹی'' کے اجتماع میں بتائی اور تب سے یہ فقرہ بعد میں ہم سب کا تکیہ کلام بنا)۔

''لوئے لالا'' ہم دونوں کا مشترک دوست تھا..... چمن کا اچکزئی، لحیم شحیم اور خوش گفتار لوئے لالا۔ ایک بار وہ جب ڈاکٹر خدائیداد کے گھر آیا تو دیکھا کہ میں، کمال خان اور خدائیداد تینوں الگ الگ بیٹھے، لیٹے یا نیم لیٹے پڑھ رہے ہیں۔ لوئے لالا زور سے بولا؛ ''یارا! خبر آئے گی کہ شہر پہ دشمن کا قبضہ ہو گیا، مگر تم لوگ کتابیں پڑھنے میں ہی مصروف تھے''۔

سائیں کے جو دوست مطالعہ نہیں کرتے تھے (میں اُن میں شامل ہوں) انہیں وہ برملا ٹوکتا تھا۔ اور ٹوکنے کا اُس کا اندازہ بہت کاٹ دار ہوا کرتا تھا۔ باتوں باتوں میں کہہ دیتا؛ ''تہ خوشکر دئی کتاب نہ ویائے'' (تم تو شکر ہے کتاب نہیں پڑھتے ہو)۔ کمال خان طنز کے کوڑے مار مار کر اپنے دوستوں کو مطالعہ پہ لگا دیتا تھا۔ اس کی ہمیشہ کوشش رہی کہ جو کتاب انگریزی میں دستیاب ہو، اس کا مطالعہ میں بھی کروں۔ وہ اس کے پڑھنے کا مجھے پُرزور مشورہ دیتا۔

اسی طرح اپنی پارٹی کا ترجمان اخبار نہ ہونے اور اپنے احباب کے لکھنے کی عادت نہ ہونے پر وہ بہت کڑھتا تھا۔ جو شخص لکھ سکتا تھا مگر نہ لکھتا تو وہ ایک اور خوبصورت فقرے سے اُسے یوں کوڑے مارتا تھا؛

''فلاں تو بس منہ سے بات کرتا ہے''۔ (یعنی لکھتا نہیں ہے)

سائیں کی یاری ایسے لوگوں کے ساتھ رہی جو کتاب پڑھنے اور خریدنے والے ہوا کرتے۔ اول الذکر کیٹگری کے لوگ ذرا کم کم ہیں، مگر دوسرے گروپ کے افراد نسبتاً زیادہ ہیں۔ سائیں اس قدر دلکش شخصیت اور مہربان استاد تھا کہ وہ جب بھی کوئٹہ آتا تو اس کے دوست اپنے خیالات کو تازہ اور نیا نویلا کرنے کے لئے سائیں کے ساتھ ساتھ رہتے۔ سائیں بھی اپنی عادت کے مطابق انہیں تعلیم دیتا رہتا، معلومات دیتا رہتا..... چلتے چلتے بولتے بولتے۔ آخر میں جا پہنچتا کتابوں کی دکان پر۔ سائیں اُس دوست کے لئے کتابوں کا انتخاب کرتا۔ اور خود اپنے لئے بھی دو چار کتابیں خرید کر اپنی چادر میں لپیٹ کر باہر نکل آتا۔ مگر وہ یہ کتابیں اپنے پاس رکھتا نہیں تھا۔ وہ اصل میں یہ کتابیں دوستوں کے حلقے میں جھونک دیتا۔ ہاں، البتہ پہلے خود پڑھ لیتا۔ چنانچہ اُس نوے سالہ کتاب پرست انسان کی موت پر اُس کے گھر محض تین چار سو کتابیں نکلیں۔ (انہیں تین چار ہزار بنانے اور وہیں اُس کے گھر میں ''کمال خان لائبریری'' کے قیام کا عہد بہت سے دوستوں نے کر رکھا ہے)۔

سائیں بہت عقلمند مسافر تھا۔ منصوبہ بنا کر آتا کہ کوئٹہ سے واپسی پر کتابیں ساتھ ہونگی۔ خانہ بدوشوں کے کارواں کی طرح واپسی پر کتابوں سے بھرا ایک بیگ ہمیشہ اس کے دل و ذہن میں رہتا۔

خدائیداد کے گھر ٹھہرتا تو سردیوں میں دھوپ پہ جا بیٹھتا اور شروع ہو جاتا پڑھنے۔ میرے گھر ہوتا تو بچے اسے پڑھنے نہیں دیتے تھے اور سائیں رات کو اٹھ کر مجھے جگائے بغیر بتی جلا کر کتاب پہ حملہ آور ہوتا۔ اگر یہ سب ممکن نہ ہوتا تو پھر فجر کی نماز پڑھنے اور میرے جاگنے تک کے درمیان ایک آدھ چیپٹر پڑھ ڈالتا۔

پڑھنے کا اس کا ڈھنگ بھی نرالا ہوتا تھا۔ بھلا آپ نے کبھی 90,80 سالہ بوڑھے کو اس انداز میں مطالعہ کرتے دیکھا ہے کہ اس نے لیٹے ہوئے کتاب سینے پر رکھی ہو، اُس کا دھڑ زمین پہ ہو اور ٹانگیں اوپر دیوار کے ساتھ ساتھ ٹیک لگائی ہوئی ہوں؟۔ سائیں دیوار سے ٹانگوں کے بل اس طرح ٹیک لگائے مطالعہ کرتا کہ مکمل زاویہ قائمہ بنا لیتا۔ وہ اپنی بڑی موٹی چادر سے اُس وقت دو کام لیتا۔

اسے تکیہ بھی بنالیتا اور سورج کی تیز روشنی سے آنکھوں کو بچانے کا سائبان بھی۔ اور اِس سائبان کا کنارہ سورج کی حرکت کی رفتار کی مطابقت میں اوپر نیچے سرکتا رہتا۔ سائیں اس قدر انہماک سے پڑھتا تھا کہ اگر درخت کے نیچے لیٹے مطالعہ کر رہا ہو تو شاخ پہ کسی وقت آن بیٹھنے والا پرندہ اس کے ساتھ جو چاہتا سلوک کرتا۔ اسے وقوعہ ہو جانے کے بعد ہی پتہ چلتا تھا۔

کمال خان شیرانی زیرِ مطالعہ کتاب کی کوئی عملی عزت نہیں کرتا تھا۔ گو کہ وہ سب سے پہلا کام یہ کرتا تھا کہ اُس پر اخبار چڑھا دیتا تا کہ کتاب میلی نہ ہو۔ مگر وہ اس کتاب کے حاشیوں پہ بڑی بے دردی کے ساتھ اپنا قلم چلاتا .....سوالیہ نشان' Underline اور تبصرے وہیں اُسی جگہ پر لکھتا.....بغیر کسی خاص وجہ کے' بغیر کسی اشتعال کے۔ میں نے بہت سی کتابیں ایسی دیکھی ہیں جہاں اگر اُسے کوئی بات پسند آئی تو اُسی فقرے کی مطابقت میں کوئی فارسی' اردو یا پشتو شعر' مصرعہ یا ضرب المثل لکھ ماری۔ یا مصنف بے چارہ کوئی واقعہ سنجیدگی سے بیان کر رہا ہوتا ہے تو وہ اس کے آخر میں لکھ دیتا؛ ''this is part of the game''۔ یا کہیں لکھ مارتا؛ ''Interesting''۔ ہم جیسے کاہل قاری بہت بار اُس کی دی ہوئی کتاب کے صرف وہ حصے پڑھ کر ہی ''عالم فاضل'' بن جاتے جہاں اُس نے لائنیں لگائی ہوتی تھیں۔

وہ اپنے لئے کوئی نوٹس نہیں لیتا تھا' نہ ہی کوئی فقرہ وغیرہ کہیں کسی رجسٹر یا کاپی پہ نقل کرتا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اتنا خوبصورت حافظہ رکھتا تھا کہ کتاب کے چیدہ چیدہ فقرے اور باتیں برسوں تک اپنی گفتگو میں ''Quote'' کرتا رہتا۔ مثلاً ایک انگریز کی لکھی کتاب میں پاکستانی حکمرانوں کے بارے میں مصنف کا ایک مشاہدہ اسے اتنا پسند تھا کہ وہ اُسے ہر وقت دہراتا رہتا۔ وہ لفظ واقعی بہت بامعنی تھا۔ اس انگریز نے کتاب تو انگریزی میں لکھی۔ مگر واوین والا اردو کا لفظ رومن انگریزی میں ہو بہو لکھا، اُس کا ترجمہ نہیں کیا۔ اس نے لکھا؛ ''مجموعی طور پر پوری تاریخ میں پاکستانی حکمران' گھبراہٹ' میں مبتلا رہے ہیں۔ یہی لفظ ان کی شناخت و علامت ہے''۔ سائیں نے اس لفظ کے گرد ایک دائرہ لگا دیا۔

المختصر کچھ بھی ہوتا، سائیں کتاب پر لکھتا ضرور تھا۔ حتیٰ کہ بہت بار میں نے دیکھا کہ وہ زیر

مطالعہ کتاب پر تاریخوں، ناموں یا واقعات کی تصحیح بھی فرماتا۔ اسی لئے تو ڈاکٹر خدائیداد کہا کرتا تھا؛

''سائیں کتاب کو پڑھتا ہی نہیں اُس کو.....بھی ہے'' (گالی)۔

سائیں کو جاننے والے سارے احباب یہ بات جانتے ہیں کہ سائیں ہمارے خطے کا انتہائی خواندہ شخص تھا۔ وہ آخر تک اپنی ''Self Cultivation'' میں ہمہ وقت مصروف رہا۔ جب بھی ملتا اس کی چادر کے پلو میں کوئی کتاب ضرور بندھی ہوتی۔ وہ مطالعہ کا زور برداشت کر سکتا تھا۔ اس کے ''شاک ابزاربر'' بہت زیادہ مضبوط تھے۔ اسے کوئی یوٹوپیا، کوئی یوفوریا نہیں تھی۔ خواہ جتنے بھی اچھے اچھے یورپی خیالات اور قصے پڑھتے ہوں مگر پھر بھی اپنے علاقے کے حالات اور ماحول کو فراموش نہیں کرتا تھا۔ وہی بات چھیڑتا جو اس کے علاقے میں چل سکتی تھی۔

سائیں کمال خان کو اگر پڑھنے کے لئے اپنی پسند کا مواد نہ بھی ملتا تو مجبوری کی حالت میں جو کچھ بھی ملتا پڑھ لیتا۔ کوئی نیا پرانا رسالہ، کوئی اخبار، کوئی کتاب۔ لیکن اگر موجود ہوتی اور انتخاب کی گنجائش ہوتی تو وہ سب سے زیادہ فلسفہ کی کتاب پر جھپٹا مار لیتا تھا۔ دوسرے نمبر پر تاریخ اور وہ بھی اپنے علاقے اور اپنی قوم کی تاریخ دلچسپی سے پڑھتا تھا۔ ہمیں سیاست کے بارے میں کتابیں اسی سے ملتی تھیں۔ ویسے بھی جو کتاب یورپ میں بیسٹ سیلر کے بطور آ جاتی وہ کوئی نہ کوئی دوست اُسے لا کر ضرور دیتا۔ لہٰذا میرا دعویٰ ہے کہ پاکستان میں کوئی بھی مشہور کتاب سب سے پہلے جن آٹھ دس آدمیوں کو ملتی، کمال خان اُن میں سے ایک ہوتا۔

کمال خان سوشلزم کے بانیوں کی کتابیں دوبارہ پڑھنے پر کبھی آمادہ نہ ہوتا۔ نہ ہی وہ سوشلزم کے متعلق کوئی نئی نصابی قسم کی کتاب پڑھنے پر راضی ہوتا۔ میں اصرار کرتا تو مجسم انکار بن کر کہتا: ''یہ شناختہ باتیں ہیں''۔

اچھا ہوا کہ کتابوں کا یہ عاشق وہ زمانہ آنے سے پہلے مر گیا جب کمپیوٹر، کتاب کی جگہ لے لے گا۔ سب کچھ سکرین پہ موجود ہوگا اور کتاب نایاب ہوگی۔ کتنا ڈراؤنا منظر نامہ ہوگا وہ، جسے برصغیر کے آج کے سب سے بڑے شاعر گلزار نے کھینچا ہے؛

زباں پر ذائقہ آتا تھا جو صفحے پلٹنے کا
اب انگلی کلک (Click) کرنے سے بس اک جھپکی گزرتی ہے
بہت کچھ تہہ بہ تہہ جھلکتا چلا جاتا ہے پردے پر
کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا، کٹ گیا ہے
کبھی سینے پہ رکھ کر لیٹ جاتے تھے
کبھی گودی میں لیتے تھے
کبھی گھٹنوں کو اپنے رحل کی صورت بنا کر
نیم سجدے میں پڑھا کرتے تھے، چھوتے تھے جبیں سے
وہ سارا علم تو ملتا رہے گا بعد میں بھی
مگر وہ جو کتابوں میں ملا کرتے تھے سوکھے پھول
او مہکے ہوئے صفحے
کتابیں مانگنے گرنے، اٹھانے کے بہانے رشتے بنتے تھے
اُن کا کیا ہوگا؟
وہ شاید اب نہیں ہوں گے!

گلزار

سائیں کمال خان کے مستغرق مطالعے کا ایک اور سبب یہ بھی تھا کہ وہ 'کانوں سے 'بہت'' اونچا سنتا تھا۔ چھوٹی موٹی آواز اسے ڈسٹرب نہیں کرسکتی تھی۔ بہرہ پن اس قدر تھا کہ آپ چاہیں آدھ گھنٹہ تک ''ابوالکلام'' کے بھی ابا بنے رہیں، سائیں کے ''بائیں پاؤں پہ'' (انگریزی محاورے کا لفظی ترجمہ) اور اگر آپ نے کوئی قابلِ بحث طویل بات کرنی ہوتی تو سمجھ لیجئے کہ پچھلے جنم میں آپ نے ضرور کوئی کبیرہ گناہ کیا تھا۔ چیختے چیختے آپ کا گلہ رندھ جاتا۔ جواب میں (اگر آپ نئے اور ناواقف ہیں تو وہ کان کو ہتھیلی سے ہاتھی کے کان کی طرح آگے کر کے پشتو میں کہتے: ''زہ خوکنٹریم'' (میں تو بہرا

ہوں)۔ ایک شخص دس پندرہ منٹ تک ان سے بولتا رہا ہو اور اچانک کمال خان بہت معصوم چہرہ لئے اس سے کہے کہ ''میں تو بہرہ ہوں'' تو اندازہ کرلیں اُس جنموں جلے پہ کیا بیتتی ہوگی۔ اور اگر آپ جانے پہچانے ''بحث تافتہ'' ہوتے تو وہ بس مسکرا کر کہتا: ''دا نو ستا فلسفہ دہ'' (یہ تو تمہارا فلسفہ ہے)۔ دلچسپ ترین بات یہ ہوتی تھی کہ ''بہرا'' کمال خان خود بالکل اونچا نہیں بولتا تھا۔ وہ دنیا کا واحد بہرا تھا جو خود بہت دھیمی آواز میں، حتیٰ کہ کھسر پھسر جیسی کم آواز میں بات کرتا تھا۔

سائیں اپنے مخاطب کی بہت ساری باتوں کا مطلب تو اُس کے لبوں کی جنبش اور اُن ہونٹوں کے بدلتے زاویوں اور اس کے چہرے کے عمومی تاثرات سے اخذ کرتا تھا۔ مگر عموماً اتنے بڑے لطیفے ہوتے تھے کہ الامان! ہنس ہنس کر پیٹ پکڑ لیجئے۔ آپ پوچھیں، ''سائیں کیا حال ہے؟'' تو جواب دیتا، ''کل آیا ہوں''۔ آپ پوچھیں، ''ژوب میں بارشیں ہوئی؟'' تو وہ کہیں ''منی بس پہ آیا ہوں''۔ اور اگر یہ گفتگو سائیں اور ماما (عبداللہ جان جمالدینی) کے بیچ ہو رہی ہوتی تو آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ماما کی ہنسی ایک صدی تک نان سٹاپ جاری رہتی۔ (ماما پہ جب بھی ہنسی کا دورہ پڑتا ہے تو وہ بغیر کسی سبب اور وجہ کے دیر تک قہقہے لگاتے رہیں گے)۔ سائیں نے ''بلوچستان سنڈے پارٹی'' کی محفل کو کئی بار ایسے حیات افروز قہقہے عطا کیے۔

ماما عبداللہ جان جب لمبے عرصے کے لئے نوشکی جاتے تو ہم کسی اتوار کو ان سے ملنے کوئٹہ سے نوشکی چلے جاتے۔ ایک بار سائیں بھی ژوب سے آیا ہوا تھا۔ چنانچہ ہم سب مل کر ماما سے ملنے نوشکی میں ان کے گاؤں ''بٹو'' چلے گئے۔ قدرت میرے سوہنے رب کی، وہاں ماما کا ایک بزرگ عزیز بھی آیا ہوا تھا۔ آپ کی معلومات کیلئے عرض کردوں کہ کمال خان نوشکی میں ہرگز ہرگز اجنبی نہیں تھے۔ لوگ پیار سے انہیں ''میر کمال خان'' کہتے تھے۔ لفظ ''میر'' بلوچوں کا شناختی محترم نشان ہوتا ہے اور یہ خوبصورت اور اپنائیت بھرا لفظ، جب پشتون کمال خان کے ساتھ لگتا تھا تو اور بھی معتبر بن جاتا تھا.....اور ہم نے اس لفظ کو بارہا محترم و معتبر بنتے دیکھا ہے۔ ایسے الفاظ کی حرمت انسانیت کی حرمت ہوتی ہے۔ اور انسان کی حرمت قائم رہے تو انسانیت قائم رہتی ہے۔ اسی قیام و بقائے

انسانیت کے لئے تو کمال خان جیسے لوگوں کا نزول ہوتا رہتا ہے۔

الغرض ماما کا وہ عزیز جب جان گیا کہ کوئٹہ سے آنے والوں میں ''میر کمال خان'' بھی ہے تو وہ اپنے اس 40,45 برس پرانے دوست سے بڑے خلوص' گرمجوشی اور تپاک سے ملا اور اسے کھینچ کر اپنے ساتھ بٹھا دیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ سائیں سے دس گناہ زیادہ بہرا تھا اور اوپر سے نابینا بھی۔ اب جو گفتگو تھی وہ ظاہر ہے کسی ہم آہنگی، کسی ہارمنی سے پاک تھی۔ وہ کچھ بول رہا تھا اور اس کا طنبورا کچھ بول رہا تھا (بہرہ بمقابلہ بہرہ)۔ مگر چند ہی لمحے بعد یہ بات چیت یک طرفہ طور پر چلنے لگی اس لئے کہ سائیں کمال خان تو بینا تھا۔ اسے ہماری اور بالخصوص ماما جمالدینی کی دبی ہنسی نظر آئی تھی اور اس نے یک دم اندازہ کرلیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اور جب اسے پتہ چلا کہ دال پورے کا پورا کالا ہے تو وہ بھی زیر لب مسکرا دیا۔ کمال خان اس وطن کی مسکراہٹ تھا (اور اِس وطن پہ شالا ابد تک خفگی نہ پھٹکے!)۔

سائیں کا بہرہ پن ایک لحاظ سے خود اس کی خواہش کے سبب بھی تھا۔ اس سائنسی دور میں وہ کابل و مکہ و مدینہ و لندن و ماسکو و دہلی جیسے ترقی یافتہ طبی سہولتوں سے بھرے شہروں میں پھرتا رہا' خود یہاں ایک ایک ڈاکٹر اس پر صدقے واری جانے کے لئے تیار تھا مگر کمال خان اپنے بہرے پن کا علاج جان بوجھ کر نہیں کرتا تھا۔ پتہ نہیں اپنی غیبت سننے میں اسے کیا مزہ آتا تھا!

سائیں نے اپنے کانوں کی کمی کو دوسرے حسی اعضا سے پورا کر رکھا تھا۔ ایک دفعہ کسی کو تلخی سے جواب دیتے ہوئے اس کو کہا تھا؛'' I can hear with my eyes,۔

بوڑھی زیرک آنکھیں!!

آنکھ اور کان کی بات ہو رہی ہے تو یہ بھی سن لیجئے کہ سائیں کمال خان کی عادت تھی کہ وہ سفر میں ہو یا گھر میں دو بینڈ والا جاپانی پینا سونک ریڈیو ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔ اور دنیا بھر کے سٹیشنز کی خبریں اور تبصرے سنتا تھا۔ اونچا سننے کی وجہ سے بستر میں ریڈیو کان سے لگا کر سنتا تھا۔ یوں وہ شہر کے پاکستانی نیوز چینلوں کی پھیلائی جہالت سے بھی بچا ہوا ہوتا اور ہم سب سے زیادہ باخبر بھی رہتا۔

قلمکار کمال خان

سائیں پشتو زبان کی ساخت، گرامر، منابع اور مزاج کا مالی تھا۔ وہ پشتو زبان و ادب کی تاریخ کا امین اور رکھوالا تھا۔ اُسے اپنی زبان سے بے پناہ محبت تھی اور ہمہ وقت اس کی ساخت و پرداخت سے جڑا رہتا تھا۔

کمال خان نے چند بہت ہی اہم کتابوں کے پشتو تراجم کیے۔

وہ ذکر کرتا تھا کہ اس نے ''سقراط کا مقدمہ' جیل اور زہر کا پیالہ'' نامی مقالے کا پشتو ترجمہ کیا تھا۔ افلاطون کے ''ڈائیلاگز'' کا ترجمہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی۔ یہ ترجمہ میں نے اس کی موت کے بعد اس کے گھر میں کاپیوں رجسٹروں پر درج دیکھا ہے۔ یقیناً کوئی علم دوست یا زبان دوست فرد یا ادارہ اس کی اشاعت کا انتظام کرے گا۔

والٹیر انقلابِ فرانس کا ترجمان دانشور تھا اور اس کی شہرہِ آفاق کتاب کا نام تھا ''کینڈڈ''۔ سائیں نے اس کا ترجمہ ''سپسلی'' کے نام سے کیا جو چھپ چکی ہے۔

گورکی کی خودنوشت سوانح حیات کا پہلا حصہ My Childhood تو اُس کے استاد

صاحبزادہ ادریس کی فرمائش تھی۔

اسی طرح اس نے مشہور برطانوی مارکسسٹ دانشور اور ادبی نقاد کرسٹوفر کاڈویل کی شہرہِ آفاق کتاب ''Studies in a Dying Culture'' میں سے ایک باب "Liberty" کا پشتو ترجمہ کیا۔ اور وہ بھی شیرانی لہجے میں (جب یہ کتابچہ ''آزادی'' کے نام سے چھپا اور ڈاکٹر خدائیداد نے اسے پڑھا تو ازراہِ مذاق کہا تھا؛ ''یہ تو جنوں اور بلاؤں کی زبان ہے لہٰذا میں کمال خان کے اس پشتو کا سلیس پشتو ترجمہ کروں گا'')۔

جان ریڈ کی کتاب Ten Days that Shook the World اور کرسٹوفر کاڈویل کی کتاب کے ایک باب یعنی ''Liberty'' کے بارے میں ہم دونوں کا فیصلہ تھا کہ اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کریں گے۔ چنانچہ کمال خان نے انہیں پشتو میں اور میں نے بلوچی میں یہ دونوں چیزیں ترجمہ کیں۔

اسی طرح Islam in Practice کا ترجمہ ''رشتنی اسلام'' کے نام سے کیا۔

اس نے جتنے تراجم بھی کئے سب اپنے شیرانی والے لہجے میں کیے۔ وہ ارادتاً ایسا کرتا تھا۔ وہ نام نہاد سٹنڈرڈائزیشن کے چکر میں نہیں پڑتا تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنی زبان یعنی پشتو کے بھرے خزانے میں سے شیرانی لہجے کے الفاظ کو حذف کرنے پر تیار نہیں تھا۔ وہ یہ الفاظ ڈھونڈتا، اکٹھا کرتا اور استعمال کرتا تھا تاکہ یہ الفاظ گم نہ ہو جائیں۔ یہ فرمائش اس سے خان عبدالصمد خان اچکزئی نے بھی کی تھی۔ چنانچہ اس نے پشتو کے سیکڑوں الفاظ کو زندگی اور بقا بخشی۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ میں کوہستانی اکھڑپن موجود ہے۔

وہ جب کوئی انگریزی کتاب ترجمہ کرتا تھا تو میری طرح اسے بار بار ڈکشنری دیکھنا نہیں پڑتی تھی۔ اس کی انگریزی بہت اچھی تھی۔ نیز، اس لئے بھی کہ وہ اردو کے بجائے پشتو میں ترجمہ کرتا تھا جو کہ ذخیرہ الفاظ سے بھری پڑی ہے۔

ترجموں کے سلسلے میں ہم دونوں کی کوشش رہی کہ ہماری زبانوں کے اچھے سُچے الفاظ گم

ہونے سے بچ جائیں۔ سائیں نے اپنی مقدور بھر پور کوشش کی اور پشتو زبان کے گم ہونے والے کونوں کھدروں میں پڑے بہت سے الفاظ چھان کر اور صاف کر کے دوبارہ استعمال کئے۔ اس طرح اپنی زبان وادب کی صفائی ستھرائی اور ترقی کی تدابیر کیں۔

سائیں نے ہماری درخواست پر ہمارے ''نوکیں دور'' رسالے کے اجرا کے موقع پر ایک یک کالمی پیغام پشتو میں لکھا تھا، اسی طرح اس نے ہمارے اسی رسالے کے ''میر غوث بخش بزنجو ایڈیشن'' کیلئے پشتو میں ایک مضمون لکھا تھا۔

اسی طرح جب ہمارے استاد اور کمال خان کے گہرے دوست ڈاکٹر خدائیداد کا انتقال ہوا تو اس نے چار چھ فقرے ماہنامہ سنگت کے لئے دیے؛

''اے ہے پیارا ڈاکٹر خدائیداد فوت ہو گیا۔ موت برحق ہے، ہر کسی نے مرنا ہے۔ خدائیداد بہت ہنرمند شخص تھا اور اس نے اپنی پوری زندگی اپنے بس کے مطابق، ہنر اور ادب کی پرورش کی۔ ماہنامہ ''پشتو'' کا سارا کام وہ سخت نا ترس حالات میں سرانجام دیتا تھا۔ میرا تو ویسے ہی نام تھا۔ اس نے اپنی بس کی حد تک پشتو اور پشتونوں کی بہت خدمت کی، اور نئی روشن فکر کے پھیلانے میں اپنا فریضہ ادا کیا۔

خدا اس کی مغفرت کرے۔

کمال خان شیرانی

ماہنامہ سنگت، دسمبر 2003ء''

جہاں تک تصنیف کا تعلق ہے تو سائیں نے خود کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔ وہ مصنف نہیں، مصنف ساز تھا۔ اُس کے کتنے شاگرد ہیں جو آج مصنف ہیں اور درجنوں کتابوں کے خالق ہیں۔

ہمارے ایک مشترکہ بیوروکریٹ دوست حمید خان اچکزئی (مرحوم) اور سائیں آپس میں اچھی خاصی کھلی ڈلی گفتگو کرتے تھے۔ حمید خان اکثر سائیں کو کہتا کہ، ''میں آپ کو ادیب نہیں مانتا۔ آپ تو دراصل شپانہ (چرواہا) ہیں۔ آج تک میں نے ''سریزہ'' (پیش لفظ) لکھنے پر کسی کو

ادیب ہوتے ہوئے نہیں دیکھا''۔(واضح رہے کہ سائیں نے محمود خان اچکزئی اور عبدالرحیم مندوخیل کی کتابوں کیلئے کل دو دیباچے لکھے تھے جسے پشتو میں ''سریزہ'' کہتے ہیں،) سائیں مسکرادیتا کہ حمید خان کی بات تو صحیح تھی۔

سائیں نے کبھی مصنف ہونے کی خواہش بھی نہ کی تھی۔ دوست اصرار کرتے رہے مگر وہ کہتا ''بس نہیں ہوتا''۔ وہ کئی نسلوں کا استاد تھا جنہیں اس نے شعور دیا، بولنے کا لکھنے کا، سیاست کرنے کا۔

یہ تو ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ سائیں نے پچھلی صدی کی پچاس کی دہائی میں اپنے رسالہ ''پشتو'' میں صرف ایک اداریہ لکھا تھا۔ جو مادری زبان کی اہمیت اور اس کے مقام کے بارے میں تھا۔

سائیں کمال خان عصری شعور کا ترجمان تھا۔ وہ روایتی ادیبوں اور شاعروں کو تنقید کا نشانہ بناتا تھا، انہیں ''خرافات'' لکھنے کا دوش دیتا تھا۔ وہ انہیں سماج کو غیر سیاسی بنانے اور شکست خوردگی کی طرف دھکیلنے کا ذمہ دار گردانتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ دانشور اور لکھاری تو اپنے عوام کا ترجمان ہوتا ہے' اُس کے پاس تو درباری، سرکاری بننے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

سائیں کے پاس ہمیشہ پارکر یا شیفر کا بال پین ہوا کرتا تھا۔ جو ظاہر ہے اسے تحفہ میں ملتا۔ میں نے اسے کم قیمت قلم کے ساتھ لکھتے کبھی نہیں دیکھا۔

سائیں کمال خان شیرانی سے میری خط و کتابت بھی اچھی خاصی ضخامت پکڑتی گئی۔ ہماری مفصل خط و کتابت تو اُس وقت شروع ہوئی تھی جب میں لاہور میں اعلیٰ تعلیم کے لئے گیا ہوا تھا اور اُن کا بہت ہی پیارا بچہ رشتیا مل میرے پاس تھا۔

اس کے بعد بھی ہماری خط و کتاب جاری رہی۔ سائیں کی عادت تھی کہ وہ خط لمبا لکھتا تھا، پشتو میں لکھتا تھا یا پھر انگریزی میں۔ اس نے ایک خط بھی مجھے اردو میں نہیں لکھا۔ وہ جواباً بھی طویل خط کا تقاضا کرتا تھا۔ اس طرح کہ کسی تفصیل کی اسے پھر ضرورت نہ پڑے۔ اس کی دلچسپی تھی کہ میں اسے اپنی صحت کے بارے میں، اپنے مطالعے کے بارے میں اور اپنی تصانیف کے بارے میں مفصل لکھوں۔

وہ میرے بچوں بھائیوں کے بارے میں تفصیل سے سننا چاہتا تھا۔ اور پھر ماوند کے بارے میں ہر نئی تازی بات سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ سائیں کوئٹہ میں اپنے دوستوں کے بارے میں ایک ایک تفصیل طلب کرتا۔ خصوصاً ماما عبداللہ جان کی صحت کے بارے میں۔ وہ پنجاب میں حفیظ احمد، میاں محمود، خواجہ رفیق، ملک اسلم اور سی آر اسلم کی خیریت ہر وقت پوچھتا تھا۔

کمال خان کے غیر مصنوعی، بلا واسطہ اور اپنائیت بھرے خطوط میں سے ایک نمونہ؛

Dear Shangul Sahib,

Bekhi Der Salamoonah.

My reasons for not writing to you were quite different from those of yours. Being a "lat" i was thinking of your coming here some time or other & therefore felt no need of writing a letter; though being anxious as to what happned to you. Your last call through Eid Muhammad was that you will definitely come to Zhob & inform us before coming . Now i am expecting you every day. Today in the morning Rishtia's mother told me that she saw you in dream & that you had come to Silizah. This of course is wishful thinking. But frankly speaking I passionately wish that you should come here for a few days. This passionate wish has nothing to do with

Rishtia's interlude. You and your capacity of a revolutionary & Marri might have taken that case too seriously which actually is not so. I wish to have your company for some days to talk about so many abundant new things. Muhammad Jan's elder son Anwar died in Kabul & was brought here by his fellows some four or five days ago. This is a further reason why you should come here. But surely you must finish your academic problems first of all. As I sais above Eido told me that you will come to Zhob. But recently Ilyas said to me that you told him that you will be coming to Qta shortly after submitting your thesis. So please do come to Zhob, becouse I wish you to come so passionately & also please let me know before when you will be coming. If possible write to me about your exams's etc. Please don't delay yourself in Lahore for socialisti Salams from all & mine for Hafeez & Mahmood Mian & Junaid.

Your's

K Khan Sherani

اس طویل خط و کتابت کے علاوہ میرے پاس اُن کی بے شمار چھوٹی چھوٹی پرچیاں بھی موجود ہیں۔ جن پہ وہ لوگوں کو سفارشی خط کے بطور دیتا تھا۔ محکمہ صحت سے متعلق، فلاں کو میری طرف سے یہ درخواست کرنا، فلاں سے اس شخص کی سفارش کرنا.....سائیں کسی شخص کو مایوس نہ لوٹا تا۔ ذرا ایک ''چٹ'' آپ بھی ملاحظہ کریں:

11-11-1992

گرانه سُانگل صاحب

سلامونه . د ٹک پروخت لکه چی ستا وینا وه، راشکاره نه سوے . خیر

زما عزیز ... د کمپاونڈ ری درے یم او آخیری چانس لپاره امتحان ورکوی. ارباب سکندر ته هم زما سلامونه وایه او تا ته هم خواست کوم چی زما دغه عزیز خاما خا او ضرور بالضرور راکامیاب کڑئی. او ، کور والا او طارق د غوته سلامونه .

ستا کمال خان سُیرانی

وہ عرفان کاسی، سلام خان، عبداللہ جان جمالدینی، اور دوستین جمالدینی کے نام سفارشی خط ضرور لکھتا، براہِ راست یا میرے توسط سے۔ اچھا سائیں!!

آخری ملاقات

سائیں کمال خان کو بہت وقت تک اپنے کینسر کا پتہ نہ چلا۔ مگر انہیں اپنی موت کے قریب ہونے کا مکمل ادراک تھا۔ پچھلے ایک ڈیڑھ سال سے وہ اس کی پیش گوئی کیا کرتا تھا۔ وہ ہر چیز کو یوں دیکھتا تھا جیسے آخری بار دیکھ رہا ہو۔ دسیوں بار اس نے مجھ سے ایسی باتیں کہیں جن پر دھاڑیں مار کر رونے کو دل کرتا تھا مگر اس کی اِس کیفیت کو جھٹک دینے کی خاطر میں بات ٹال دیتا۔ کبھی کبھی تو اسے جھڑک بھی دیتا کہ کیا آنجہانی باتیں کرتے ہو۔ مگر مجھے یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ اس نے موت کو بہت نزدیک دیکھا ہے۔ وہ اکثر اُس فلاسفر کی بات کرتا تھا جو نوجوانوں کے ساتھ تاش کھیلتے کھیلتے رک گیا اور تاش کسی کے حوالے کر کے دوسرے کمرے میں جانے کا کہہ کر اٹھ گیا۔ دوستوں نے پوچھا کیا کرو گے دوسرے کمرے میں۔ اس نے کہا جا کر مر جاؤں گا۔ احباب سمجھے کہ تھک گیا ہے، آرام کرنے جا رہا ہے۔ مگر جب کھیل کی کچھ بازیاں کھیل کر وہ دوسرے کمرے گئے تو دیکھا وہ فلاسفر آرام کرسی پر دراز تھا اور سکون سے مر چکا تھا۔

وہ پشتو کا ایک شعر تو بہت بار دھراتا تھا؛

شیریں عمر چی تیریژی دریغہ دریغہ

دَاوبو پہ سیر بہیژی دریغہ دریغہ

وہ عام حالات میں ڈاکٹروں سے چیک اپ نہیں کراتا تھا (حالانکہ سارا دن ڈاکٹروں کے ساتھ گزارتا)۔ وہ پیشاب میں خون آنے کی وجہ سے ہسپتال کی طرف راغب ہوا۔ تشخیص؛ مثانے کا کینسر۔ یہ ٹیسٹ، وہ ٹیسٹ۔ علاج؛ ریڈیو تھراپی۔ یاروں نے اپنی طرف سے اُسے اُس کی بیماری کا نام نہیں بتایا، مگر وہ لوگ یہ جانتے تھے کہ بھلا اسے کیسے شک نہ گزرے گا۔ دسیوں بار اس نے اپنی بقیہ زندگی کے اختصار کی باتیں کیں اور ہر بار ہم اُس سے جھوٹ بولتے۔ اس کی بے بس آنکھیں چیخ کر کہتیں، ''ارے تم بھی جھوٹی تسلی دے رہے ہو؟''۔

ڈاکٹر واحد، حفیظ شیرانی، سائیں کی بیماری میں اس کے بیٹوں کی خوب مدد کرتے رہے.....اُس کی دلجوئی، اس کی خدمت اور عیادت میں خوب لگے رہے۔

پھر خبر آئی کہ سائیں کا دیہاتی لنگوٹیا یار گلک مر گیا۔ اور پھر اُس کا بھائی نواب خان وفات پا گیا۔ تب تو سائیں بار بار کہتا تھا کہ یہ اموات دراصل میرے لئے reminder calls ہیں۔ مگر ہم تھے کہ حوصلہ، امید اور قوتِ ارادی کا اپنا سارا مبلغ علم اُس پر جھاڑ مارتے۔ اُس کا مختصر جواب یہ ہوتا تھا؛ ''کچھ بھی ہو میرے دِن اب مختصر ہیں''۔

مرض کی تشخیص کے بعد وہ شوکت خانم ہسپتال لاہور لے جایا گیا۔ وہاں اس کی بیماری کی تصدیق ہوگئی اور اُس کے بیٹوں کو اُس کی زندگانی کے چند روزہ ہونے کی بات سمجھا دی گئی۔ علاج کا کورس ہوا۔ وہیں میرا بیٹا مہر اللہ پڑھتا تھا، سائیں کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا۔

سائیں واپس ژوب آ گیا، اپنی دھرتی پہ اپنی سرزمین میں۔ اسی سرزمین پر جس کے پہاڑوں نے ایک روز سوگ میں مرجھا جانا تھا، جس کے پتھروں نے بولنا بند کر دینا تھا۔

اُس کی بیماری کی خبر ہمارے ایک دوست نے کراچی میں نواب خیر بخش مری کو سنائی تو انہیں جیسے جھٹکا لگا ہو۔ رکے، اور بلوچی میں پیغام دیا کہ سائیں کو کہو؛

''مہ مر، دانڑتی مہ مر، مارگزرئے۔ تہ چھڑو پٹھانے نہ یئے، انسانے یئے۔ اسلام آباد ءَ نہ روئے، تقریر واگھی سیٹ ءَ نندوخے نہ یئے.....''

(نہ مرنا، ابھی نہ مرنا، ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ تم صرف پشتون نہیں ہو، تم انسان ہو۔ تم اسلام آباد نہیں جاتے ہو، تقریریں نہیں کرتے ہو، اگلی سیٹوں پہ نہ بیٹھنے والے ہو)۔

ہم قیدِ حیات سے اس کی رہائی پانے سے پچیس دن قبل، زندگانی کے اس قیدی سے ملنے ژوب گئے۔ دو دن، دو راتیں اپنی محبوب ہستی اور ابریشمی دوست کے ساتھ رہے۔ پڑھنے کا کچھ مواد اسے دیا۔ ایک کتاب اُس سے تحفے میں وصول کی۔ دوستوں نے تصویریں بنائیں۔ باہمی اشک باری کی اور باجماعت اشک شوئی کی کوششیں کیں۔

ہمارے دوست نے نواب مری کا پیغام جو ایک چٹ پر لکھ چھوڑا تھا سائیں کو دیا۔ سائیں نے دیکھا، دو تین بار ترجمہ سنا اور بہت بھاری پن سے اپنی جیب میں ڈال دیا۔

اُس کے بہت اصرار اور اُس کی خوشی کی خاطر مہمانی میں اُس کا دنبہ کھایا۔ اس کے بچوں، پوتوں سے ملے اور اسے بے چین کیے رکھا۔

اُس کے بیٹے رشتیامل اور بھتیجے ستار جان سے اُس کے مقبرے کی جگہ پہ گفتگو کی اور ایک جگہ کے انتخاب میں اپنا ووٹ شامل کیا۔

.....ہم روتے دلوں (مگر جبراً بے اَشک آنکھوں) کے ساتھ ایک دوسرے سے برق رفتاری سے آخری بار بغلگیر ہوئے کہ مبادا ہم دونوں کے سینے آنکھوں میں چھلک نہ جائیں۔ شکستہ دل اور شکستہ گاڑی کے ساتھ کوئٹہ واپس ہوئے.....مہینہ بعد پھر لوٹنے کو.....

میں کراچی میں تھا اور 5 نومبر 2010ء کی شام کو مجھ پر بلوچستان سے میرے گرودیو، ٹیگور جیسے میرے گارڈین اور افتادگانِ خاک کے اِس ہمدرد کی موت کے ایس ایم ایسوں کی بے بخت بارش ہونے لگی۔ کسی کو یقین نہ تھا اور وہ تصدیق کرنا چاہتا تھا، کسی کو میری حالت پہ رحم آ رہا تھا، کوئی خود غمزدہ تھا۔ پہلا ایس ایم ایس جیئند جمالدینی کا تھا۔

مجھے ڈاکٹر واحد نے سائیں کی موت کی خبر یوں سنائی؛ ''اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کردو/اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔''

میں نے پڑھ کر دل میں کہا، ''اڑے سادہ!''

مگر پھر اس کا اگلا ایس ایم ایس یوں تھا؛

"But remain his comitment, his teachings, his memories, We will live cherished with his sweet sweet friendship"

کمال خان کے عروج سے حاسد کہکشاں بالآخر انہیں زمیں دوز کر کے رہی۔ اور سائیں ہم میں نہ رہے۔ وہ سائیں زندہ نہ رہا جو زندگی سے پیار کرتا تھا، بھرپور پیار کرتا تھا۔ وہ زندگی کے ساتھ انتہائی ذمہ دار تھا۔

اپنی بیوہ اور بچوں کی بھتیجوں عزیزوں، قبیلہ اور پشتون قوم کے نچلے طبقے سے وابستہ عوام کے ساتھ ساتھ پڑوسی اقوام کی قومی عوامی تحریکوں کو زبردست نقصان ہوا.....اس کے جانے سے ہمارے پورے خطے سے نیکی اور انسان دوستی کی بہت بڑی دولت چھن گئی۔ عالمی مزدور تحریک کو نقصان۔ ہم خرد افروزی کے ایک ہول ٹائمر سے محروم ہوئے۔ انسانی نجات و آزادی کو مشن کے بطور لے کر چلنے والے ایک معتبر سپاہی سے محروم ہوئے۔

پبلک لائف اور سیاسی سرگرمی کے 88 سال نے موت کے وقت اس کو اس خطے کے روشن فکر ترین دماغوں کے بطور ممتاز کر دیا۔ وہ ہمارے منطقے کے ان چند لوگوں میں سے تھا جنہوں نے جمہوری سوچ کو گہرائی عطا کی، سائنسی سوچ کو مضبوط کیا اور محکوموں کو سیاست کے مرکزی سٹیج پر لانے کی جدوجہد کی۔ وہ عدل و انصاف کی جدوجہد کرنے والوں میں ایک علامت ایک سمبل بن گیا تھا۔ سیاسی وابستگی سے ہٹ کر پورے منطقہ کے سیاسی افق پر اسے ایک مکمل انسان اور بڑے قومی عوامی رہنما کے بطور تکریم دیا جاتا تھا۔ وہ ترقی اور انقلابی تحریک سے وابستگان کے لئے ایک فیض کا منبع اور مشوروں کیلئے ایک ہمدرد بزرگ تھا۔ 88 برس تک یہ اباسین (لفظی مطلب دریاؤں کا باپ، دریائے

سندھ) فکر وشعور، علم وعقل کے صحراؤں کی آبیاری کرتا کرتا 5 نومبر 2010ء کو ساگر میں جاملا۔ اکیلا نہیں بلکہ اپنے پورے عہد کے ساتھ، اپنے مہذب رکھ رکھاؤ، اپنی مقدس ظلم دشمنی اور پاکی پاکیزگی کے عہد کے ساتھ۔ گفت وشنید کا ایک کلچر مر گیا۔ باہر کسی جینوئن سرخ ستارہ والے پرچم کی غیر موجودگی میں احباب نے دلوں میں لہراتے سرخ پرچم سرنگوں کر دیے۔

بلاشبہ کمال خان شیرانی کی بیش بہا تعلیمات ہم سب کیلئے ہیں، راہنمائی کرنے کو۔ سورج کئی نظام ہائے شمسی خلق کرنے کے بعد مکینِ گِل ہو چکا۔ اب کے سائیں نہ تھا، اُس کی قبر تھی۔ قبر جو دریا کے کنارے سرسبز، گھنے اور حسین جنگل کے اندر بنائی گئی ہے۔ جمالیات کے دلدادہ کی ایسی قبر جس کی تقدیر میں تا قیامت گلہائے عقیدت پیش کرنے والوں کا آنا جانا لکھا جا چکا ہے۔ روشنی پھیلانے والے، سمت بتانے والے ''سنگِ میل''، سنگِ میل ہی رہ جاتے ہیں، خواہ وہ ایستادہ ہوں یا زمانے کی رفتار کی گزر گاہ میں بالآخر گر پڑیں۔ اب کے سائیں نہ رویا میں رودیا، پھوٹ پھوٹ کر.....اکیلا.....دنیا کی وسعتوں میں اکیلا.....وہ کیوں روتا؟ اس کی روح تو کوہِ شاشان کی طرح شانت تھی، مطمئن، بلند۔ جُز، کل سے مل چکا تھا، غنی غنی میں جذب ہو چکا تھا، کوہِ سلیمان کا بیٹا اُس کے دامن میں ایک عرصہ تک رہنے کے بعد سونے کے لئے اُس کے رحم میں واپس چلا گیا تھا، ابدی نیند سونے۔ نیچر کا ایک مظہر نیچر کے ہزار مظاہر کو جنم دینے نیچر کی وسعتوں میں شامل ہو گیا۔

سائیں کی قبر، جیسے کسی کمسن نوجوان کی ہو۔ ایسے بڑے ذاتی دوست اور عظیم انسان کی قبر پر جایئے اور دو آنسو نہ بہایئے تو آپ تو انسانیت سے باہر پتھر کے مجمعے میں شمار ہوں.....مگر وہیں کہیں، اپنے اپنے انداز اور اپنے اپنے الفاظ میں کمال خان کی موت پر اقبال کا یہ شعر نہ پڑھیں تب آپ کی انسان شناسی پہ شک ہو جائے؛

چناں بزی کہ اگر مرگ تست مرگِ دوام
خدا زکردہِ خود شرمسار تر گردد

پسماندگان

سائیں نے مندوخیل قبیلہ میں شادی کی تھی۔ اُن کی یہ وفا شعار اور درویش بیوہ اپنے رفیقِ حیات کی فکری باتوں اور طبعی اولاد کی خدمت اور سلامتی کی دعاؤں کے لئے باہمت انداز میں زندہ ہیں۔ کمال خان اپنے دیگر پسماندگان میں سیکڑوں دوستوں، ہزاروں پیروکاروں کے ساتھ ساتھ پانچ بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑ گئے ہیں۔

بیٹی سب سے بڑی ہے۔ ہمارے ایک ڈاکٹر دوست کی بیگم ہیں اور اپنے بچوں اور خاندان کے ساتھ خوش وخرم ہیں۔ اس کے بعد رشتیامل سب سے بڑا بیٹا ہے (''رشتیا'' سچ کو کہتے ہیں اور ''مل'' ساتھی کو۔ یعنی سچ کا ساتھی۔ جب یہ بچہ لاہور میں پڑھتا تھا تو وہاں پشتو سے ناواقفیت کی بنا پر اِس بچے کو سب حیرت سے دیکھتے تھے۔ ہندو سمجھ کر؛ رشتیامل!!)۔

وہ اور میرا بڑا بیٹا طارق وہاں گوالمنڈی کے علاقے میں نسبت روڈ پر مون لائیٹ (پرائیویٹ) انگلش سکول میں پڑھتے تھے۔ رشتیامل بہت ہی مؤدب، مہذب اور سلجھا بچہ تھا۔ مجھے یاد ہے جب میرے اچھے دوست غیاث، سائیں کے ساتھ اسے لاہور لائے اور چار

پانچ دن ٹھہر کر ننھے بچے کو بہت ہی غیرت بھرے لیکچر دلا دلا کر بالآخر اچانک واپس چلے گئے تو یہ بچہ دیر تک روتے ہوئے کہتا رہا ''لالا لاڑئی، لالا لاڑئی''۔ اسے بہلانے کے جتنے گُر مجھ بے چارے کو یاد تھے میں نے آزما لئے۔ مگر کہاں تک۔ پھر اس کا حل میں نے یہ سوچا کہ کم از کم تین گھنٹے اسے جنگ و جدل سے بھرپور انگریزی فلم دکھاؤں تا کہ اسے غیرت دلا سکوں۔ پتہ نہیں اس معصوم کو غیرت آئی یا نہیں لیکن فائدہ یہ ہوا کہ ایک تو وہ تین گھنٹے امن سے گزرے کہ بچہ انہماک سے فلم دیکھتا رہا۔ اس کے بعد فلم سٹوری کے اثرات دو تین گھنٹے تک رہے اور پھر تھکاوٹ والی اس کی نیند اچھی رہی۔ غالباً یہ اس کی زندگی کی پہلی فلم تھی۔ (نام مجھے یاد نہ رہا)۔

تعلیم میں بچہ بہت ہی اچھا تھا۔ میری آنکھوں کا تارا تھا۔ پھر لاہور میں نسبت روڈ پر ہی میرے بہت ہی اچھے بزرگ ساتھی ''ایوب'' صاحب رہتے تھے۔ وہ میرے ان دونوں بچوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جب چھٹی ہو جاتی اور میں بچوں کو سکول سے لینے میں دیر کرتا تو وہ بچوں کو لے کر اپنے گھر لے جاتے، چائے کھانا وغیرہ کھلاتے اور میرے آنے تک وہ اور اُن کے گھر والے انہیں اپنے بچوں کی طرح رکھتے۔ وہ اب حیات نہیں ہیں مگر ان کی انسانیت، مجھ سے ان کی محبت اور میرے بچوں کی دیکھ بھال میں ان کی رغبت مجھے کبھی نہیں بھولے گی۔ میں اپنی چھوٹی سی زندگانی میں نہ جانے کتنے ہزار لوگوں کے احسانوں کا زیر بار ہوں۔ اس لئے جب کبھی سائیں پنجابیوں کے خلاف نفرت کا جنرلائزڈ فقرہ بول لیتا تھا تو مجھے از حد تکلیف ہوتی تھی۔

''رشتیا'' یعنی سچ تو سائیں کمال خان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ اس ایک لفظ کا عاشق تھا۔ حفیظ اللہ بتاتے ہیں کہ سائیں کو خوشحال خان کا یہ شعر بہت پسند تھا اور وہ بار بار یہ شعر سننے کی فرمائش کرتے تھے؛

ځوان وم دا یم زوړ سُوم په رسُتیا رسُتیا خبرو
ټول عالم د ځان دسُمن کړم که دا عیب وي نو دي وي

اُسی سچ پر کمال خان نے اپنے بڑے بیٹے کا نام رکھا رشتیا مل۔

رشتیا مل ایک ذمہ دار، باشعور اور والد کی تعلیمات سے باخبر نوجوان ہے۔ وہیں گاؤں میں رہتا ہے اور درجہ چہارم کا ملازم ہے۔ گھر کا خرچہ چلانے کے لئے کھیتی باڑی کرتا ہے۔

اچانک کم عمری میں والد کی ساری ذمہ داری اُس پہ پڑی ہے۔ اور والد بھی عام ہما و شما نہیں کمال خان شیرانی تھے۔ اللہ اُسے حوصلہ عطا کرے۔

دوسرا بیٹا پشتون یار ایم اے کر کے این جی اوز میں چھوٹی چھوٹی اور عارضی ملازمتیں کرتا رہتا ہے۔ باقی تینوں بیٹے محمود یار، خیبر اور میوند یونیورسٹی لیول میں زیرِ تعلیم ہیں۔ سائیں کی صاحبزادی سکولی تعلیم سے محروم ہیں۔ اپنے گھر میں اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ خوش خوشحال ہیں۔

سائیں کے تین بھائی تھے مگر وہ جنہیں ''برادرانِ یوسف'' کہتے تھے۔ ایک یعنی نواب خان ابھی حال ہی میں فوت ہو چکے ہیں۔ ابراہیم خان اور مٹھا خان وہیں گاؤں میں رہتے ہیں اور اپنی غربت اور وقار میں زندگی گزارتے ہیں۔

ان کے بہترین دوستوں میں عبداللہ جان جمالدینی حیات ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے بے شمار چاہنے والے ہیں۔ ''ڈی کلاس کلب'' نامی ایک سخت گیر شرائط کی حامل تنظیم میں ان کے تین اور دوست ہیں۔

’سیغیں ترمپاں گل زمیں آ‘

(کمال خان کی وفات کے بعد ماہنامہ ’’سنگت‘‘ کا پہلا اداریہ)

بڑا نقصان ہوا ہے.....ہمیں ذاتی بھی، ادارہ سنگت کا بھی، سنگت کے قارئین کا بھی اور فکرِ سنگت سے وابستہ انسانوں کا بھی .....سارے انسانوں کا نقصان ہوا ہے‘ وہ انسان خواہ پشتون ہوں بلوچ ہوں‘ ایشیا کے ہوں یا افریقہ کے ..... جدوجہد کا نقصان ہوا ہے، فکرِ مستقیم کا نقصان ہوا ہے، حق کا نقصان ہوا ہے، حق کے قافلے کا نقصان ہوا ہے۔ مادرِ وطن کے بے کراں آسمانوں سے ایک بہت بڑا ستارہ ٹوٹا.....سائیں کمال خان شیرانی اس دنیا سے پردہ کر گئے۔

اُن احباب کے صدقے جاؤں جنہیں اُن کے بارے میں معلومات نہیں ہیں۔ ہماری سرخروئی کہ زندگی بھر گمنام رہنے اور رکھنے کی اُن کی خواہش کا احترام کرتے رہے اور اُن کا اپنا بڑا پن کہ ڈی کلاس رہنے کی خاطر، کبھی زور سے کھانسے تک نہیں۔

انسان کسی بڑے انسان کو ہمیشہ اچھے لفظوں میں یاد کرتا ہے۔ مگر کیا کیجئے کہ معاشی سیاسی بحران کے ساتھ ساتھ دنیا میں ایک بہت بڑا بحران پیدا ہوا ہے۔ وہ ہے الفاظ کا بحران۔ معاصر دنیا

میں سرمایہ داروں نے اتنے شور سے بولنا شروع کر دیا کہ محکوموں کی آواز دبانے کے لئے اب انہیں مزید کسی مارشل لا، سنسر اور پابندیاں لگانے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب تو حق اور سچ کی آواز اُن کے شوروغل سے ہی دب گئی ہے۔ 100 ٹی وی چینلز صرف پاکستان کے، بھارت، افغانستان، ایران، بی بی سی، سی این این اُس کے علاوہ ہیں۔ یوں الفاظ کا تبرک، اور اصطلاحات کا تقدس بورژوازی یا تو اڑا لے گئی یا ان کی حرمت کو خاک آلود کر گئی۔ ہم بھلا سائیں کو ’’حق پرست‘‘، کیا کہیں گے کہ یہ لفظ تو حقیر ہو گیا۔ ’’انقلابی‘‘؟ نہیں‘ اس لفظ کو کب کی پھپھوندی لگ چکی کہ ہر شیخ رشید، ہر الطاف حسین، ہر شہباز شریف اور ہر طرح کا انقلاب دشمن‘ لفظ انقلاب استعمال کرتا پھرتا ہے اور یوں اس لفظ کا بھاری پن اُن کے بازاری پن کی نذر ہو چکا ہے۔ دسیوں اور الفاظ ذہن میں آئے‘ سب ہم نے جھٹک دیے کہ سب آلودہ ہو گئے ہیں۔ الفاظ، گندی زبانوں کے ہاتھوں آلودہ، گندی نیتوں کے ہاتھوں لہولہان.....ایک لفظ بھی سلامت نہیں رہا۔ بس ایک اور لفظ میں ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ انسانیت نے کیا کھویا؟.....انسانیت نے ’’کمال خان شیرانی‘‘ کو کھو دیا ہے۔

اس پورے منطقے نے ہمارے عہد کے سماجی تبدیلی کے اپنے سب سے بڑے اور سب سے خاموش سپاہی کو کھو دیا ہے۔ علم، شعور اور اتحاد کے سب سے بڑے طرفدار کو کھو دیا ہے۔ ایک ایسا شخص کھو دیا ہے جس نے مشکل پسند رہ کر ذہانت حاصل کی تھی، جو روایت کو جھٹک کر روشن خیال بنے تھے۔ جو بے چین، مشکل اور اختراع پسند تھے۔ کمال خان مقدس ماضی کی زلفوں کے اسیر نہ تھے۔ سائیں اپنے اطراف ایک جمہوری معاشرہ قائم کر کے اس میں زندہ تھے۔ برداشت کا سمندر کھو دا تھا اس نے اپنے میں، اور انرجی کی رفتار سے دور بھاگے ہر طرح کے شاؤنزم اور فاشزم سے۔ .....ہم نے طبقاتی اور قومی آزادی کے سب سے قدآور انسان کو کھو دیا ہے۔

ہم نے ایک ایسا سوشلسٹ کھو دیا جو فرد کے دل سے دور بیٹھ کر سوشلزم سوشلزم رٹتا نہ تھا، جو فرد کو بے یار و مددگار اُس کے مقدر کے سپرد کرنے والوں میں سے نہ تھا بلکہ وہ تو آپ کے بہت قریب ایک کامریڈ کے بطور، ایک گہرے غم خوار کے بطور، ایک مخلص دوست کے بطور، ایک بڑے بھائی اور

باپ کے بطور موجود رہتا تھا۔ایک ایسا مفکر جو اپنی فکر، کاغذ وقرطاس کے بجائے آپ کے دل پر نقش کر دیتا تھا.....ہم نے انسانیت کا ایک بہت بڑا اثاثہ کھو دیا ہے۔

ایک خاک بسر انسان جس نے زندگی بھر خود کو ''میں''، ''لیڈر''، ''استادوں کا استاذ''، ''عظیم انسان''، ''شیرِ بلوچستان''، ''بابو'' اور دیگر القابات وخطابات سے بہت دُور رکھا۔(القابات انسان کو انسان نہیں رہنے دیتے!!)۔ہم نے مہذب ترین انسانوں میں سب سے زیادہ مہذب انسان کو کھو دیا ہے۔

سائیں کمال خان ہمارے مروجہ فکری نظام کے ٹھہرے تالاب میں سوالات کے کنکر پھینک کر سوال کرنے کے عمل کو تحریک دینے والے فلاسفر تھے۔وہ سماجی رسوم ورواج کی زنجیروں کو توڑ کر مجبوروں کے حوصلے بلند کرتے تھے۔

زندہ رہے تو ہر شخص تک قابلِ رسائی تھے، مر گئے تو ہر جگہ موجود ہیں کہ اُن کا ذکر وجہِ مسکان ہوگا۔وہ مسرورِ دل تھے، اطمینانِ قلب تھے، نظریہ تھے، فکر تھے، فلسفہ تھے، انسانیت تھے۔سائیں نے ہر دم محنت پہ فخر کیا اور وہ محنت کش کی عظمت وشرف کے لئے زندہ رہے۔ہم نے ایک ایسا شخص کھو دیا جس کے تصور سے ہی اجڑی روحوں میں مسرتوں کے گلشن سجنے لگتے ہیں۔

ایسا بچہ جس کے گاؤں میں سکول نہ تھا' دور دوسرے گاؤں جا کر کسی کے گھر رہ کر پرائمری پڑھا، سکالرشپ لے کر سرکاری سکول سے مڈل کیا، سکالرشپ حاصل کر کے ہائی سکول پڑھا..... اور پھر اسلامیہ کالج پشاور سے بی ایس سی آنرز میں گولڈ میڈل لے لیا۔

ہم لگ بھگ انگریز کے وقت کی بات کر رہے ہیں' جب وہ نائب تحصیلدار بنتے ہیں۔ رعونت سے نفرت کے سبب نوکری چھوڑ عوام کی صفوں میں واپس آ جاتے ہیں۔انسانی شرف وخیر چاہنے کی تحریک منظّم کرنا چاہتے ہیں۔آزادی، آبادی، عدل، برابری اور امن کی تحریک بنانا چاہتے ہیں۔پشتو ادبی ٹولنہ بناتے ہیں، پشتو رسالہ کے بانی ایڈیٹر بنتے ہیں، لٹ خانہ چلاتے ہیں، ورور پشتون کے ساتھی بنتے ہیں.....مقہوروں کے ابدی ساتھی بنتے ہیں۔

تھری پیس میں ملبوس خوبرو نوجوان، شہر چھوڑ، درویشوں کی سی سادگی کے اڈے، گاؤں چلا

جاتا ہے۔ایسی گمنام انسانی خدمت کہ اٹھاسی برس کی زندگی میں ایک بار بھی ریڈیو پہ نہ بولے، ٹی وی پہ نہ آئے، سٹیج پہ نہ بولے، مہمانِ خصوصی نہ بنے، اسمبلی سیٹ ٹھکرا دیے، وزارت امارت نہ لی.....''بڑا'' نہ بنے۔

وہیں اپنے گوشے میں بیٹھ کر علم کے پیاسوں کو کٹورے بھر کر پلاتے رہے۔خیر بچاتے رہے، خیر پھیلاتے رہے، نوجوانوں کو سمت دینے کا کام، مخمصوں میں غلطاں مقہوروں کی رہبری کا کام، نظریات کے خزینے بانٹنے کا کام، قدامت سے چھٹکارہ دلانے کا کام، فکری قید کے جالے توڑنے کا کام، ذہنوں کو روایت وماضی سے آزاد کرنے کا کام۔ڈی کلاس بن کر اور زندگی بھر ڈی کلاس رہ کر دربدروں میں سے پہچانے جائے جانے کے اعزاز کے حصول کا کام.....اور یہ سارے کام کام نہ رہیں اگر ہر ہر ساعت نہ کیے جائیں، زندگی بھر نہ کئے جائیں۔

قبائلی سماج میں رہتے ہوئے بھی ان کا کوئی شخصی دشمن نہ تھا۔اپنے فلسفے اور نظریے پہ تسلسل سے چلتے رہے اور قبائلی جنگوں سے بچتے رہے، اوروں کو بچاتے رہے۔اخلاقی طور پر اس بہت ہی بااثر شخص کا ''ہرنیا'' کا آپریشن سرکاری ہسپتال کے جنرل وارڈ میں ہوا تھا، اُن کی آنکھ میں لینز ایک خیراتی میڈیکل کیمپ میں لگا، اُن کے کینسر کا علاج اجڑے ہوئے لوگوں کے ''اثر ورسوخ'' اور بیٹے کی مقروضی سے ہوا۔دل کی دولت سے مالا مال کمال خان کی مالی حالت کمزور ہونے کے سبب ان کے بچے پرائیویٹ اداروں میں نہیں، سرکاری سکولوں میں کالجوں میں پڑھے۔اُن کے کوئی پلاٹ اور مربعے نہیں ہیں۔کمال خان نے کوئی جائیداد نہ بنائی۔اُس نے اپنی کوئی آٹو بایوگرافی نہ بنائی۔

اس گولڈ میڈلسٹ کا گھر کچا ہے، اس کا بیٹا نائب قاصد ہے، اس کا نام اقتدار وجاہ وسرمایہ کے رجسٹروں میں کہیں بھی نہیں ہے، اس کی عیادت پہ کوئی ایسا شخص نہ گیا جس کا تعلق جبر کے قبیلے سے ہو، اس کو غسل کسی ایسے شخص نے نہ دیا جسے کبھی کبر نے چھوا ہو، اس کا جنازہ کسی ایسے نے نہ پڑھایا جو ابوذر غفاریؓ کا ناپسندیدہ ہو.....اس کی موت پہ کسی ایسے نے آنسو نہ بہائے جس کے ہاتھ اور زبان سے کسی بھی انسان کے کبھی بھی آنسو نکلے ہوں۔

اُس شخص کی عظمت یہ ہے کہ اس کی موت پہ نظامِ جبر پہ قائم ریاست کا پرچم سرنگوں نہ ہوا، نشریاتی اداروں نے ماتمی دُھن نہ بجائی، ایک بھی سکول ایک دن کے لئے بھی بند نہ ہوا، کوئی تعزیتی پیغام نشر نہ ہوا، کوئی ہیلی کاپٹر اُس کے گاؤں نہ آیا۔ ہاں مگر، خطے کے بیدار ضمیروں کے مالک نوجوانوں کی محبوباؤں نے کمال خان کے لئے نفلیں ادا کیں۔ یار ایک دوسرے کا غم کم کرنے کے لئے دیر تک باتیں کرتے رہے۔

کم آبادی والے بلوچستان کے ایک ویران گاؤں کے اس بوڑھے فقیر کے جنازے پہ دس ہزار افراد شامل تھے۔ اس کی یاد ایک اشک آلود مسکراہٹ رہے گی۔ اس باوقار ترین شخص کی باوقار قبر پر ہر باوقار شخص باوقار طرز پہ رو دیا۔ پورا قافلہ رویا۔ اُس کی موت پہ اُس کا تخت سلیمان مرجھا گیا، بلوچستان کی فضا روئی، ہوا ماتمی ہوئی۔ بلوچ کا قلم، کاغذ اور نطق ہچکی آمیز آنسوؤں میں ہیں، اُس کے غم میں اداریہ ماتمی ہے..... بارشیں عدّت میں ہیں۔

ضمیمہ نمبر 1

ماہنامہ پشتو کا پہلا اداریہ

بلوچستان کے پشتون اپنی مادری زبان سے ہر روز دور ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ایک اتنی واضح حقیقت ہے کہ اس کا مظاہرہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں ہوتا ہے۔ اور ہر کوئی اس حقیقت کے آثار ہماری اجتماعی زندگی کے ہر حصے میں دیکھ سکتا ہے۔ اس حقیقت کی انتہائی افسوسناک شکل ہمارے نئے تعلیم یافتہ لوگوں میں پشتو پر تمسخر اور کچھ کراہیت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ حالانکہ یہی وہ لوگ تھے جن سے پشتو پر پورا اترنے کی توقع کی جاتی تھی۔

یہ صورتحال ایک دم غیر معمولی حادثات کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک تدریجی عمل ہے جو اپنے پیچھے حالات و واقعات کی ایک پوری تاریخ رکھتا ہے۔ اس تاریخی پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو آج پشتونوں اور بالخصوص تعلیم یافتہ پشتونوں کی اپنی مادری زبان سے غفلت کچھ زیادہ عجیب بھی نہیں لگتی۔ مگر اگر خدانگتی بات کی جائے تو ہم سے تو ہماری تاریخ بالکل گم ہے۔ اس وجہ سے ہماری حالت اس آدمی جیسی ہے جس نے کہ قوتِ حافظہ کھو دیا ہو۔ اس لئے کہ ایک عقلمند شخص نے کہیں کہا تھا کہ ایک قوم کے لئے اپنی تاریخ ایسے ہے جیسے کہ ایک فرد کے لئے اس کی قوتِ حافظہ۔

یہ صاف بات ہے کہ پشتو ٹولی کا یہ مقصد سارے پشتونوں کے ساتھ مشترک ہے۔ اور

پشتونوں میں اور بالخصوص دانشور پشتونوں پر زیادہ ذمہ داری ہے۔ اور پشتو بلوچستان کے سارے پشتون دانشوروں سے یہ امید رکھتا ہے کہ وہ پشتو کی ہر طرح سے امداد کریں گے۔

جب تک کہ بلوچستان کے پشتو کے قلم کے مالک پشتو کے ساتھ تعلق پیدا کریں اور کافی مواد جمع ہو جائے، ہم اس کسر کو پشتو کے قدیم ادب سے انتخاب کی صورت میں پوری کرتے رہیں گے۔ ویسے اس کی ضرورت بھی ہے۔

ضمیمہ نمبر 2

انگریزی استعمار اور افغانستان

(یہ مضمون جناب عبدالرحیم مندوخیل کی کتاب کے پیش لفظ کے بطور لکھا گیا تھا)

ترجمہ: حفیظ اللہ واک شیرانی

ایک نامور تاریخ دان نے کہا ہے کہ افغانستان کی سرزمین پوری تاریخ کا ایک چوراہا، جنکشن یا چوک رہا ہے۔ یہاں کے باسی دنیا کے چہار اطراف سے جارح انسانی لہروں کا سامنا کرتے رہے ہیں اور انہیں روکتے رہے ہیں۔ ان کا مختلف النسل لوگوں اور ان کے تمدنوں سے واسطہ پڑا اور اس حقیقت نے افغان عوام پر اچھے اثرات کے ساتھ ساتھ سے برے اثرات بھی چھوڑے۔

جب ایک قوم ایک ایسے چوراہے پر بستی ہو اور ساتھ ہی وہ اپنے وطن، خودمختاری اور روایات کے ساتھ جنوں کی حد تک محبت رکھتی ہو۔ تو اس کے لئے دو راستے رہ جاتے ہیں یا تو وہ ان طاقتور جارح لہروں میں ابدی طور پر ڈوب کر اپنا نام ونشان کھو دے گی یا پھر زندگی بھر ان لہروں سے ٹکراتی رہے گی۔

یونانی سکندر کے زمانے سے لے کر مغلوں اور فرنگیوں تک، یہ حقیقت سب پر عیاں ہے کہ افغانوں نے ہر کسی سے ٹکر لی ہے۔ اور ان مسلسل جنگوں اور لڑائیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ افغان عوام جنگ

اور غیرت کے اعلیٰ اور نڈر ہیرو اور پہلوان بنے۔ اور اس خاصیت نے ان میں وہ عظمت اور دلیری پیدا کی کہ اُن کو اپنے اردگرد دنیا کی دوسری اقوام اپنے برابر کی نہیں لگتیں۔ وہ خود کو ان سے بہتر اور زیادہ بہادر سمجھنے لگے۔ ان کے لئے پشتو ایک ضابطہ حیات بنا۔ انہوں نے نیکی اور بدی کا اپنا ایک اعلیٰ معیار بنایا جس کو یہ ''پشتو'' کہتے ہیں۔ پشتو یا پشتو نوالہ مخلص، صاف گو، بے تعصب، اعلیٰ اور روشن فکر قدروں کا مجموعہ بنا۔ اسی لئے ان کے لئے جو سب سے بڑا طعنہ بنا وہ یہ ہے کہ ''آپ بھی پشتون ہو؟''

تاریخ کے اس چوراہے پر رہنے والے ان باسیوں کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ رہی تھی کہ یہ تاریخ کی طویل الجھنوں میں جنگوں کی صورت میں الجھے رہے ہیں اور سدا اپنا بستر پیٹھ پر باندھے خانہ بدوش زندگی گزارتے رہے۔ اس ماحول نے اس سرزمین کے باسیوں کو بہادر، جنگجو اور غیرت مند تو بنا دیا مگر ان طویل الجھنوں نے اُن کے اندر انفرادیت کو بھی کافی مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ افغان اگرچہ ایک طرف تو بہترین جنگجو بنے مگر دوسری طرف وہ بدترین سپاہی بھی بنے، کیونکہ یہ ایک مضبوط اور منظّم قومی لشکر بنانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

مسلسل جنگوں اور لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پشتون افغان عوام علم و دانش، اور کسب و ہنر جیسے اعلیٰ اوصاف سے محروم رہے۔ کیونکہ ان کو موقع ہی نہیں ملا کہ وہ علم و ہنر کو وقت دیتے۔ اسی بدقسمتی کی وجہ سے وہ تحریر کی صلاحیت سے (جو تاریخ دانی کے لئے لازمی ہے) بھی محروم ہوئے جس سے کہ وہ علم کی برکتیں بھی حاصل کرتے۔ مگر یہ اس بدنصیب قوم کو نصیب نہیں ہوا، بلکہ اُن سے تو خود ان کی وہ عظیم و مثالی تاریخ رقم کرنا بھی رہ گیا جو یقینی طور پر آج افغان سرزمین کی نسلِ نو کو اپنی ملی تشخص اور وحدت میں بہت حد تک استفادہ دلاتی۔ لیکن افسوس یہ اپنی تاریخ رقم کرنے میں ناکام رہے۔ اور کسی نے کہا خوب کیا ہے کہ جب کوئی قوم اپنی تاریخ بھول جاتی ہے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ گویا وہ اپنی یادداشت (حافظہ) کھو چکی ہو۔

انسانی ذہن میں یادداشت (حافظہ) کی قوت ایک مرکزی چراغ کی مانند ہوتی ہے جس سے ذہن کے ہر گوشے کو روشنی ملتی ہے اور اسی سے ذہن ترقی کرتا ہے۔ اب میرے محترم قارئین خود

سوچ لیں کہ جب ایک آدمی جو اپنی یادداشت (حافظہ) کھو چکا ہو یا اس میں کمی ہو تو اُس کی ذہنی صحت کے تمام حصوں میں اُس بنیادی کمی کی وجہ سے بہت ساری کمیاں موجود ہونگی۔ اس کے فعل و عمل میں کوئی ترتیب نہیں ہوگی۔ اور وہ واضح حقائق سے بھی کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکے گا۔

اب آیئے ذرا پشتون قوم اور مذکورہ بالا بغیر یادداشت یا حافظے کے آدمی کا موازانہ کرتے ہیں۔ جس سے ہمیں اپنی قوم کے لئے اپنی تاریخ کی اہمیت کا اندازہ آسانی سے لگ سکے گا۔ ہم پر جہالت اور بے علمی کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اسی لئے بیرونی حملہ آور ہم تک ہمارے اپنے اندرونی استحصالیوں جن میں خان، پیر، ملا اور آفیسر سب شامل تھے، کے ذریعے پہنچے اور ہمیں تاراج کیا۔ وہ صرف اپنے مفاد کے لئے ساری قوم اور وطن کو جنگ کے دھکتے شعلوں میں دھکیلتے رہے اور ہمیں دوسروں کا غلام بناتے رہے۔ جبکہ ہم اپنے عوام اور وطن کے خلاف ان وطن دشمن قوتوں کے گٹھ جوڑ کو نہیں سمجھتے تھے۔

ہم نے اپنی اندرونی دشمنیوں کی وجہ سے خوب گرد و غبار اٹھایا اور ان دشمنوں کی وجہ سے اپنے آپ پر اپنے خون کی بارش برساتے رہے۔ جبکہ دشمن اپنے نوالہ خور دلالوں کے توسط سے وطن کی تباہی میں خوب لگے ہوئے تھے۔ حملہ آوروں نے ہم پر ایسے وار کئے کہ انہوں نے ہم کو درمیان میں سے مکمل طور پر کاٹ کے رکھ دیا اور پھر مزید ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، کچھ کو قبائل، کچھ کو ایجنسیوں اور کچھ کو مختلف ناموں پھندوں اور داموں میں بانٹ اور کاٹ دیا۔ وطن فروش جن کو نوکریاں، خانہ نشینیاں اور اطلاعاتی الاؤنسز عنایت کی جاتی تھیں، کی وجہ سے ہم بجائے ایک ترقی یافتہ قوم بننے کے ایک غلام قوم بن چکے اور ہمارے آقا جو کچھ بھی ہمیں کہتے اور دیتے، ہم سر تسلیم خم رہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان داموں اور پھندوں کا رنگ اور نام بدل گیا اور دلالوں کی شکل بھی زمانے کے ساتھ بدلتی گئی۔ محترم اولس یار (عبدالرحیم مندوخیل) صاحب تمام پشتون قوم کی طرف سے شکریے اور تعریف کے مستحق ہیں جنہوں نے فرنگی اور افغانوں کی جنگوں کا خاکہ انتہائی خالص اور صاف پشتو زبان میں پیش کیا ہے اور میں محترم وکیل صاحب (عبدالرحیم مندوخیل) سے یہ

درخواست کرتا ہوں کہ وہ مغلوں اور پشتونوں کے درمیان لڑی گئی جنگوں کا خاکہ بھی اسی طرز پر بنا دیں۔ کیونکہ اورنگ پھر فرنگ اور بعد میں فرنگ کسی اور رنگ میں، یہ ساری کہانی بالترتیب ایک مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ پشتون نئی نسل کے زیرک نوجوانوں کی اپنی تاریخ پر گہری نظر رہے۔ کیونکہ اس سے وہ بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور جس روشن مستقبل کے لئے وہ جدوجہد کر رہے ہیں ان میں اُن کے لئے پرانے تجربے کافی کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔

یہ ہماری تاریخ کا وہ قابلِ فخر مقام ہے جس میں اگرچہ ہمیں ایک طرف وطن میں پھیلے ہوئے وطن دشمن دلالوں کا کردار نظر آ رہا ہے تو دوسری طرف ہمیں قوم کی عزت اور غیرت کو پالنے اور اس کا دفاع کرنے والے بھی بے شمار نظر آتے ہیں جنہوں نے ہمیشہ دشمن کا سامنا کیا ہے' تکالیف اور مصیبتیں جھیلی ہیں اور سروں کی قربانیاں دی ہیں۔ پشتونوں اور افغانوں کے وطن کا ایسا کونہ نہیں ملے گا جس میں وہاں کے باسی اپنے شہیدوں اور غازیوں کے بارے میں فخریہ گیت نہ گاتے ہوں۔

اکیسویں صدی کا یہ چراغ اپنے قوانین کے مطابق اُن قوموں اور انسانوں کے لئے عوامی انقلاب اور آزادی کی خوشخبری لایا ہے جو گرے ہوئے اور انتہائی پسماندگی کے شکار ہیں۔ اب دنیا کا ایسا گاؤں باقی نہ رہا جہاں کے لوگ اپنے روشن مستقبل کے لئے انقلاب لانے کی جدوجہد نہ کر رہے ہوں۔ ہر جگہ خودغرض استعماری رہبروں اور مقتدر آمروں کو گرایا جا رہا ہے۔ مگر ہمارے وطن میں عظیم عوامی انقلاب (افغان انقلاب) پر جو شور و واویلا ہو رہا ہے اور جھوٹ کا ایک بڑا گرد و غبار اٹھا ہوا ہے اور علاقہ بین الاقوامی ڈرامے کے لئے تیار ہے کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ پھر اس گرد کے پیچھے دشمن ہمارے لئے خطرناک چالیں بنا رہا ہو۔

علم و دانش کی روشنی اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ اس کے سامنے اندھیرا کہیں بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ پشتونوں اور افغانوں کو اس نئی انقلابی دنیا کی علمی برکتوں سے کافی کچھ ملا ہے اور جن کو ملا ہے وہ اس علمی روشنی کی برکتوں سے اپنی قوم کی ہمہ گیر ترقی اور فائدے کے لئے اس کا بھرپور استعمال کریں۔ جتنی زیادہ اور تیزی سے اس نئی انقلابی روشنی کو عوام میں پھیلایا جائے اتنی ہی تیزی اور ہوشیاری سے ہمارے غیرت

مند عوام اٹھیں گے۔ اور وہ اس نئے زمانے کے انقلابی علمی نظریے اور دنیا کو دیکھنے سے دوسروں کی جھوٹی خوش فہمیوں' غلط دین پرستی اور دھوکہ دینے والے نعروں کا صحیح تجزیہ و تحلیل کر سکیں گے۔ کیونکہ پوری دنیا میں گرے ہوئے اور پسماندہ عوام کی آزادی پر استحصالیوں اور استعماروں نے مذہب یا جمہوریت کی چادر اوڑھا رکھی ہے اور ان ظالموں نے ایک ہڑادھڑی مچا رکھی ہے' ایک گرد اٹھی رکھی ہے جس میں وہ ان مظلوموں کو اور ان کے حقوق اور آزادی کو اپنے زیر تسلط رکھنے میں لگے ہوئے ہیں۔

یہاں پر بیرونی سامراج، پوری دنیا کا سامراج خصوصاً امریکی سامراج اور ان کا ہم میں سے زرخرید اور نوالہ خور دلالوں (وطنی استحصالیوں اور رجعتی لوگوں) کے سیاہ اور ناروا لشکروں اور ہمارے بیدار نوجوان جو آزادی، حق پرستی اور ترقی کی صبح کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں' کے لشکروں کے درمیان سخت جنگ ہو رہی ہے۔ اس وقت جب دنیا میں استعماری علت سے پاک معاشرے بنانے والے ممالک جن کا سرچشمہ عظیم انقلاب اکتوبر تھا اور اس کے علاوہ دنیا کے ہر گاؤں میں ملی اور طبقاتی آزادی کے لئے جو جدوجہد روز بروز پھیل رہی ہے اور ساتھ کامیاب بھی ہو رہی ہے تو یہ ہمارے بیدار نوجوانوں کے لئے ایک مدد اور اُمید ہے۔ جتنے خروش اور تیزی کے ساتھ یہ نوجوان اس نئی انقلابی روشنی کو عوام میں ایک مرکزی سوچ اور ترتیب شدہ ٹیکنیک سے پھیلائیں گے اور اسی انداز میں ہمارے غیرت مند عوام کے جرگے اور مرکے منعقد ہوتے رہیں گے۔ ہماری روایات میں یہی جرگے اور مرکے شروع سے ہی ایک مشکل کام رہے ہیں مگر جب ایک بار ہم اس مرحلے پر پہنچ جائیں تو پھر ہمارے عوام کے فیصلے کافی دیرپا اور آزمودہ ہوں گے۔

اور آج کے اس بین الاقوامی ڈرامے کو روکنے کے لئے اپنے جرگوں اور مرکوں سے استفادہ کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر اس ڈرامے کو روکنا ممکن ہی نہیں۔

ہمارے بیدار نوجوان ہمارے عوام کا ذہن اور مغز ہیں۔ اسی لئے اِن سے پشتون محنت کش عوام یہ اُمید رکھتے ہیں کہ انہوں نے جس نئے انقلابی زمانے کی علمی روشنیاں حاصل کی ہیں، اُن کو اپنے غریب عوام تک سادہ اور آسان زبان میں پہنچائیں تاکہ یہ غریب عوام علم کی نئی روشنی کو آسانی سے سمجھ سکے۔

روشن فکر پشتون نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ اولس یار (عبدالرحیم مندوخیل) کے اس سوال کا گہرا جائزہ وتلاش کریں کہ آخرکار کیوں ہمارے ساتھ تاریخ میں یہ المیہ بار بار پیش آتا ہے کہ ہم جیتی ہوئی جنگ بغیر کسی وجہ کے ہار جاتے ہیں؟

یونانیوں کی ایک پرانی کہاوت ہے کہ آزادی کی دلہن تک صرف وہ شخص پہنچ سکتا ہے جو خون کے دریا میں تیر کر اُس تک پہنچے۔ اب اگر ہم اس خون کا اندازہ لگائیں جو ہمارے آباؤاجداد نے زمانوں سے اپنے وطن کی مٹی پر بہایا ہے اور اپنے غیرتی سروں کو قربان کیا ہے تو یہاں یہ سوال انتہائی گہرا تجزیہ اور تلاش چاہتا ہے کہ اتنا سارا خون آخرکار ہماری آزادی کی دلہن کی قیمت یا جہیز کیوں نہ بن سکا؟

محترم وکیل صاحب کی اس کتاب کے پڑھنے والوں کی تعداد شاید کم ہو لیکن امید ہے کہ وہ اس کتاب کو پشتونخوا وطن کے ہر کنارے تک دست بہ دست پہنچائیں گے اور بہت جلد ختم کر دیں گے۔ جب کتاب کے دوسرے ایڈیشن کا وقت آئے تو اُمید ہے کہ اولس یار صاحب یہ ''عوامی گیت''

سردار محمد ایوب خان وکڑہ جنگونہ

ہر سرہ گوریے راوستل فوجونہ

اودوست محمد ویل خدایہ کلہ بہ سہارشی.....

اور اسی طرح کے اور گیتوں کو تلاش کریں گے اور ان کو اپنی کتاب میں اپنے اپنے موقع کی مناسبت سے جگہ دیں گے۔ جس سے اگلا ایڈیشن مزید عوامی اور دلکش ہو جائے گا۔ میں اور بھی لکھے پڑھے باشعور نوجوانوں سے اُمید رکھتا ہوں، چاہے وہ عصری تعلیم یافتہ ہوں یا دینی تعلیم یافتہ کہ وہ اپنی قوم کی علمی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے اور ساتھ ساتھ موجودہ نئے زمانے کے روشن فکر انقلابی نظریوں کی روشنی میں اپنی قوم کی ہمہ گیر ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی تحریریں اور تحقیقات سامنے لائیں۔

سائیں کمال خان شیرانی

27 ستمبر، 1979ء

سائیں کمال خان.....عہد جوانی

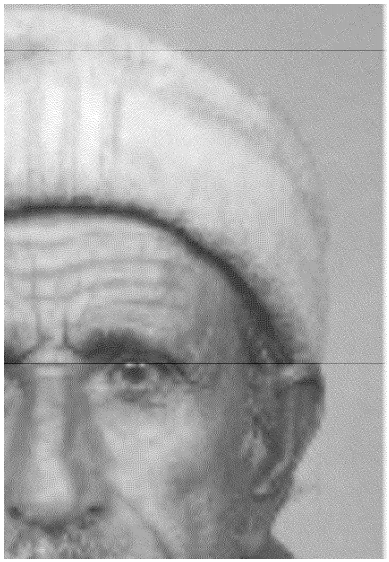

عمر پر فکر کے سائے

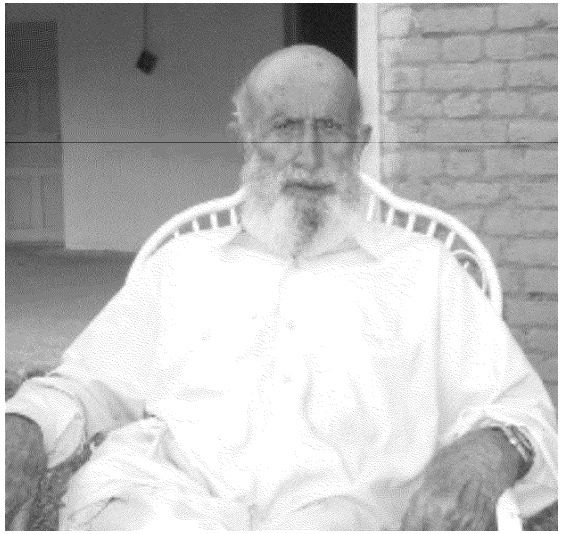

سائیں، اپنے آستانے میں

سنڈے پارٹی

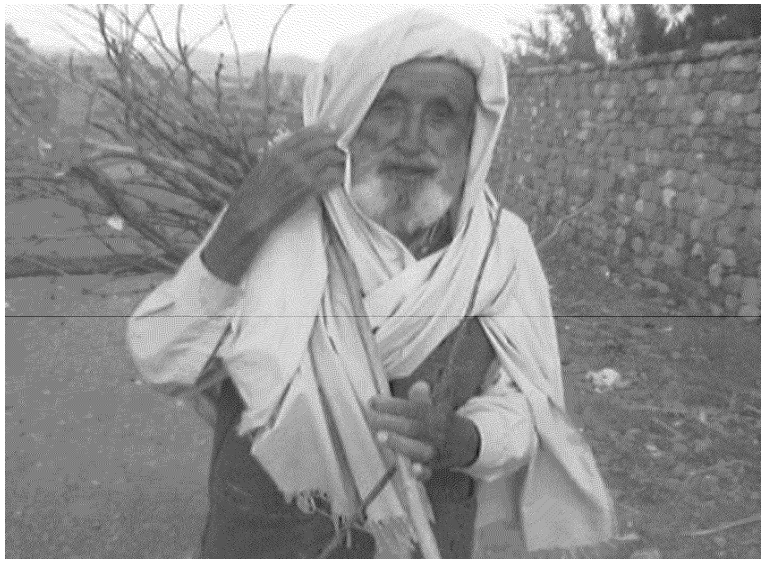

پاک آدمی، پاک اعمال کے ساتھ

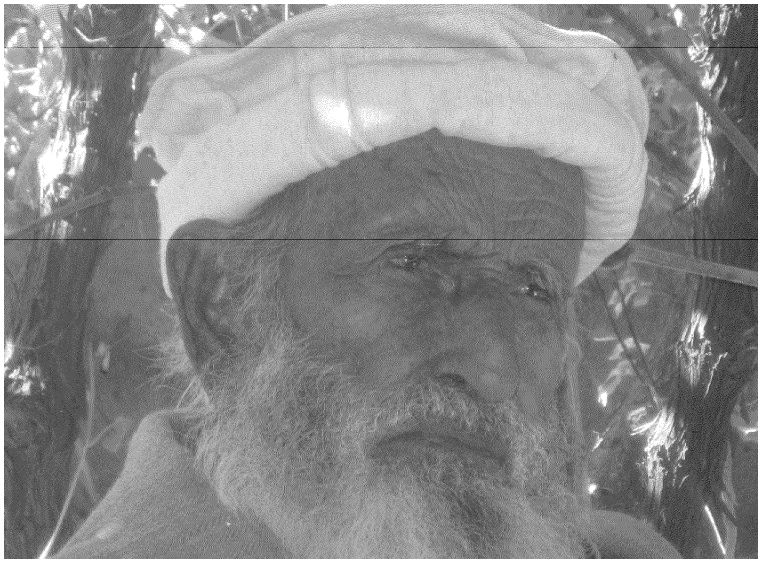

آخری ایام.....گھر کے دالان میں لگائے گائے انگور کے باغیچے میں!